سید نظر زیدی

ہمارے بزرگ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا رتبہ بہت اونچا ہے۔ آپ کی شان یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچپن کے ساتھی تھے۔ مردوں میں آپ سب سے پہلے مسلمان ہوئے۔ دینِ اسلام کو دوسروں تک پہنچانے کی کوششوں میں دل سے شریک رہے اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلے خلیفہ یعنی جانشین بنے۔ ان باتوں کے علاوہ آپ کو ایک اور عزت یہ حاصل تھی کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیوی، اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے والد تھے۔

ملکِ عرب میں جو قبیلے آباد تھے اُن میں قریش نامی قبیلہ سب سے زیادہ معزز اور طاقت ور تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق اسی قبیلے کی ایک شاخ بنی تیم سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ صاحبہ کا نام ام الخیر سلمٰی تھا۔ یہ حضرت ابوبکر صدیق کے والد کے چچا کی بیٹی تھیں۔

جس زمانے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے، عرب میں رہنے والے لوگوں کی عادتیں اچھی نہ تھیں۔ وہ کھیل تماشوں میں لگے رہتے تھے نشہ پیدا کرنے والی گندی چیزیں کھاتے پیتے اور بے گناہوں کو ستانے اور چوری ڈاکے جیسے بُرے کاموں کو بھی بُرا نہ سمجھتے تھے لیکن حضرت ابوبکر

صدیق بالکل چھوٹی عمر ہی سے ایسی سب باتوں سے الگ رہتے تھے۔ جوان ہوکر نیکی کے کاموں میں حصہ لینے لگے۔ آپ کی اچھی باتوں کا صرف اسی ایک بات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں اور دوستوں میں شامل تھے۔

اللہ پاک کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا اور یہ کہا کہ وہ بتوں کی پوجا کو چھوڑ کر ایک اللہ کی عبادت کریں اور سب برائیوں سے توبہ کر کے نیک اور شریف بن جائیں تو مکہ شہر کے رہنے والے قریشی سردار آپ کے دشمن بن گئے اور طرح طرح سے آپ کو ستانے لگے۔ لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جیسے ہی یہ بات سُنی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ پاک نے اپنا رسول بنایا ہے، وہ فوراً مسلمان ہوگئے۔ بڑی عمر کے مردوں میں سب سے پہلے آپ ہی مسلمان ہوئے۔

اللہ پاک نے اپنی سچی کتاب قرآن مجید میں یہ بات بتائی ہے کہ جو لوگ بالکل شروع کے زمانے میں مسلمان ہوئے، اُن کا درجہ زیادہ ہے۔ اس ارشاد کے مطابق بڑی عمر کے مردوں میں آپ کا درجہ سب سے زیادہ ہے۔ عورتوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محترم بیوی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور بچوں میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سب سے پہلے مسلمان ہوئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے اور بہت خوشحال تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد آپ نے پہلی قربانی یہ دی کہ آپ کے پاس جتنا روپیہ تھا، وہ اسلام کی ترقی اور غریب مسلمانوں کی مدد کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو دے دیا۔

اس قربانی کے علاوہ دوسری بات یہ کی کہ مکہ کے کافروں نے آپ کو جس قدر تکلیفیں دیں، انھیں صبر سے برداشت کیا۔ اس زمانے میں مکہ کے کافر ان لوگوں کے جانی دشمن بن جاتے تھے جو مسلمان ہو جاتے تھے۔ ایک بار تو کافروں نے آپ کو اس قدر مارا کہ لوگوں نے خیال کیا، آپ کا انتقال ہوگیا لیکن

آپ نے یہ اور ایسے ہی اور ظلم چُپ چاپ سہے اور اپنے دین پر قائم رہے۔

بہت زیادہ تکلیفیں اٹھانے کے علاوہ آپ نے غریب مسلمانوں کو کافروں کے ظلم سے بچانے کے لیے اپنا بہت روپیہ خرچ کیا۔ آپ نے بہت سے غلاموں کی قیمت ادا کر کے انھیں ان کے ظالم مالکوں کے پنجے سے آزاد کرایا۔ ان غلاموں اور کنیزوں میں سے چند کے نام یہ ہیں:-

حضرت بلال ــــ حضرت عامر بن فہیرہ ــــ اور ــــ حضرت ام عبیس وغیرہ (رضی اللہ تعالیٰ عنھم)۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خاص کاموں میں ایک یہ ہے کہ جب اللہ پاک کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکّے سے مدینے ہجرت فرمائی، یعنی اپنے باپ دادا کا شہر مکّہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لے گئے تو اس سفر میں آپ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنا ساتھی بنایا۔

یہ سفر اس وجہ سے بہت خطرناک تھا کہ مکّے کے کافروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے والے کے لیے ایک سو اونٹ انعام کا اعلان کیا تھا اور انعام حاصل کرنے کے لالچ میں بہت سے کافر گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکر اس سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور آپ کی جان کو بھی بہت خطرہ تھا، لیکن آپ ذرا نہ گھبرائے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے۔ اللہ پاک نے آپ کو اس رفاقت کا ذکر قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

مدینہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کافروں سے بہت سی جنگیں لڑنی پڑیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سب جنگوں میں پورا پورا حصّہ لیا۔ تلوار لے کر کافروں سے لڑے بھی اور جنگ کا سامان تیار کرنے کے لیے بہت سا روپیہ بھی خرچ کیا۔ ایک جنگ کے موقع پر تو آپ نے اپنے گھر کا پورا سامان رسول اللہ کو دے دیا۔

آپ کی یہ قربانی اور جاں نثاری ایسی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب مسلمان اس کی بہت قدر کرتے تھے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے تو مسلمانوں نے اتفاق کر کے آپ ہی کو خلیفہ، یعنی مسلمانوں کا سب سے بڑا حاکم چُنا۔

کسی کو کوئی معمولی سا عہدہ بھی مل جاتا ہے تو وہ اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے عیش و آرام کے ڈھیروں سامان اکٹھے کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ سب ادب سے اس کے سامنے سر جھکائیں۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق نے ایسا نہیں کیا بلکہ اسلامی سلطنت کا انتظام ٹھیک رکھنے کے لیے پہلے سے بھی زیادہ محنت کرنے لگے اور ایسا اچھا انتظام کیا کہ دنیا آج تک تعریف کرتی ہے۔

خلیفہ بننے کے بعد آپ نے جو خاص کام کیے، وہ یہ ہیں:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیماری کے دنوں میں روم کے عیسائی بادشاہ سے لڑنے کے لیے ایک لشکر تیار کیا تھا اور اپنے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اس لشکر کا سالار مقرر کیا تھا۔ یہ لشکر مدینہ سے روانہ ہو گیا تھا، لیکن ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انتقال ہو گیا اور یہ خبر سن کر حضرت اسامہؓ لوٹ آئے تھے۔

خلیفہ بننے کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت اسامہؓ ہی کو سالارِ لشکر بنا کر روانہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال فرما جانے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے یہ وقت بہت نازک تھا۔ اس لیے صحابہ کرام کی رائے یہ تھی کہ لشکر روانہ نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ صحابۂ کرام اس بات پر بھی زور دے رہے تھے کہ کم عمر اسامہ کی جگہ کسی تجربہ کار صحابی کو سالار بنایا جائے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان میں سے ایک بات بھی نہ مانی۔ فرمایا:

"جو لشکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیار کیا تھا، وہ ضرور جائے گا اور اس کی سرداری اسامہؓ ہی کریں گے۔"

دوسرا بڑا کام آپ نے یہ کیا کہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کو سزا دی اور جن لوگوں نے ایمان کی کمزوری کی وجہ سے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا ان کے خلاف جہاد کیا، زکوٰۃ کی ایک ایک پائی وصول کی اور نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والوں کا خاتمہ کر دیا۔

ایک اور بات آپ نے یہ کی کہ مدینہ کی اسلامی سلطنت پر حملہ کا ارادہ کرنے والے عیسائیوں کو سزا دینے کے لیے باقاعدہ جہاد شروع کیا۔ یہ آپ کی انہی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اسلامی سلطنت اتنی مضبوط ہوگئی اور مسلمانوں کا ایسا رعب بیٹھ گیا کہ کسی کو مدینہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہوئی اور روز بروز اسلامی سلطنت کا رقبہ بڑھتا چلا گیا۔

آپ کے ایمانی جذبے، دانائی اور ان تھک محنت کی وجہ سے ۵۸۴۰،۷ مربع میل رقبہ اسلامی سلطنت میں شامل ہو گیا تھا اور مجاہدین کے قدم آگے ہی بڑھتے جا رہے تھے کہ، جمادی الاخریٰ ۱۳ھ کو اللہ کے گھر سے آپ کو بلاوا آگیا اور آپ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ سردی کے موسم میں آپ نے ٹھنڈے پانی سے غسل کیا جس کے باعث بخار ہوگیا اور اسی بیماری میں آپ کا انتقال ہوا۔

(انا للہ و انا الیہ راجعون)

اللہ پاک ان پر اور ان کی آل اولاد پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین!

مسجد میں آجا بن کے نمازی

سن کے اذاں تو مسجد میں آجا
کر کے وضو کر ذکر خدا کا
اس طرح کرے تو اس کو راضی
مسجد میں آجا بن کے نمازی
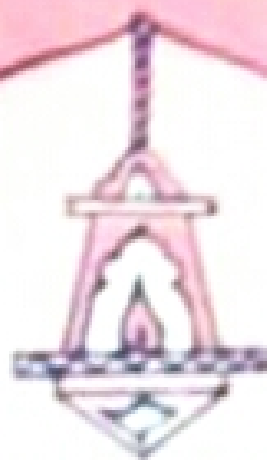
کیوں تجھ پہ ایسی غفلت ہے طاری
یاد خدا بھی ہے تجھ پہ بھاری
کب تک رہے گی یہ بے نیازی
مسجد میں آجا بن کے نمازی

ضائع نہ کر وقت اے یار جانی!
ہے چند روزہ یہ زندگانی
نیکی میں لے جا اوروں سے بازی
مسجد میں آجا بن کے نمازی

ہوگی قیامت جس روز بھائی
اچھے عمل سے ہوگی رہائی
حافظ ہو، ملا، یا کوئی قاضی
مسجد میں آجا بن کے نمازی

رب کو اگر ہے تو یاد کرتا
اس کی محبت کا دم ہے بھرتا
یہ بھی ہے اس کی بندہ نوازی
مسجد میں آجا بن کے نمازی

دنیا میں جتنے عالم ہوئے ہیں
پکے نمازی بن کے رہے ہیں
سعدی و حافظ، رومی و رازی
مسجد میں آجا بن کے نمازی

شہر کے باہر ایک کئی منزلہ عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ درجنوں مزدور، کاری گر اور دوسرے لوگ وہاں کام کر رہے تھے۔ مزدوروں، کاری گروں اور دوسرے لوگوں کی مزدوری، اُجرتوں، تنخواہوں اور کام پر خرچ ہونے والی رقم کے حساب کتاب کے لیے کئی کلرک مقرر تھے۔ یہ کلرک منیجر کے اس دفتر میں بیٹھتے تھے جو تعمیر ہونے والی عمارت کی پہلی منزل کے ایک کونے میں قائم تھا۔ اس دفتر کے کئی کمرے تھے۔ ایک کمرہ صرف منیجر کے لیے تھا اور دوسرے کمروں میں کلرک بیٹھتے تھے۔

ارشد اور خالد دو نوجوان تھے جو وہاں کام کر رہے تھے۔ ارشد دفتر میں کلرک تھا جب کہ خالد مزدور کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس عمارت سے کچھ دور ایک مکان تھا جس میں وہ کرایہ دار کے طور پر رہ رہے تھے۔ دونوں کے کمرے بھی ساتھ ساتھ تھے۔ اس لیے وہ ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے تھے۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد اُن کا زیادہ وقت اکٹھے ہی گزرتا تھا۔

ایک روز کی بات ہے کہ خالد دوسرے مزدوروں کے ساتھ کام میں لگا ہوا تھا کہ ارشد اس کے پاس آیا اور کہنے لگا :

"تمھیں مینیجر صاحب بُلا رہے ہیں۔"

خالد نے حیران سا ہو کر کہا : "کیوں کیا بات ہے ؟"

ارشد نے جواب دیا : "یہ تو مجھے معلوم نہیں۔"

خالد ارشد کے ساتھ مینیجر کے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ ارشد کے کمرے سے ہوتا ہوا مینیجر کے کمرے میں پہنچا اور سلام کر کے کہنے لگا :

"جناب! آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے ؟"

مینیجر نے اپنے کام سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا اور کہا :

"تمھارا نام خالد ہے ؟"

"جی ہاں۔"

"یہاں سے لکڑی اور دوسری بہت سی چیزیں گم ہوتی رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سب تمھاری حرکت ہے۔"

"نہیں جناب!" خالد نے جواب دیا "میں نے نہ لکڑی چرائی ہے اور نہ ہی کوئی اور چیز۔"

مینیجر نے کہا : "تم کل رات کچھ لکڑی لے گئے تھے۔ فورمین نے تمھیں دیکھا تھا۔"

"یہ صحیح نہیں ہے جناب!"

منیجر نے کہا: "فوزیہ کا کہنا ہے کہ تم لکڑی لے گئے تھے اور میرے اطمینان کے لیے یہی کافی ہے۔ میں پولیس کو بلانا نہیں چاہتا۔ بس یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ اور دوبارہ اپنی شکل نہ دکھانا!"

"لیکن جناب! میں نے تو کوئی قصور نہیں کیا!"

"دفع ہو جاؤ!" منیجر نے گرج کر کہا۔

خالد باہر کی طرف چل دیا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ رُکا اور کہنے لگا: "آپ مجھے بے قصور کام سے نکال رہے ہیں۔ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ آپ ٹھیک نہیں کر رہے ہیں جناب! یقیناً ایک دن آپ کو پچھتانا پڑے گا!"

اور یہ کہ کر وہ تیزی سے منیجر کے کمرے سے نکل گیا۔

خالد اور ارشد شام کا کھانا کھا رہے تھے کہ اُن کے دو ساتھی وہاں آ گئے۔ وہ بھی اسی مکان کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ ایک کا نام صادق تھا اور دوسرے کا حنیف۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ منیجر نے خالد کو کام سے

نکال دیا ہے تو وہ افسوس کرنے لگے۔ صادق نے کہا:
"آخر مینیجر نے ایسا کیوں کیا؟"
خالد نے جواب دیا: "وہ سمجھتا ہے کہ میں چور ہوں۔ اس کا خیال ہے کہ عمارت سے لکڑی میں نے چرائی ہے۔"
حنیف نے پوچھا: "تو کیا تم نے وہاں سے لکڑی چرائی ہے؟"
"نہیں، بالکل نہیں۔ کبھی نہیں۔" خالد نے کہا۔ "لیکن فورمین ایسا کہتا ہے اور مینیجر کو فورمین کی بات پر یقین ہے، مجھ پر نہیں۔"
"اب تم کیا کرو گے؟" ارشد نے پوچھا۔
خالد نے جواب دیا: "کرنا کیا ہے؟ کہیں اور جا کر کام تلاش کروں گا۔ میرے پاس کوئی رقم تو ہے نہیں کہ گھر بیٹھ کر آرام سے کھاتا رہوں۔"

اگلے دن مینیجر اپنے دفتر میں آیا۔ آتے ہی وہ اپنی میز کی طرف بڑھا اور اس کی دراز کھولنے کے لیے جیب سے چابی نکالی۔ پھر وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دراز پہلے ہی کھلی ہے۔ اس نے جلدی جلدی دراز میں پڑی ہوئی چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر پکارا:
"ارشد!"
ساتھ کے کمرے سے ارشد اپنا کام چھوڑ کر بھاگا بھاگا آیا۔
"جی جناب!"
مینیجر نے کہا: "میری میز کی دراز میں ایک ڈبا تھا۔ اس ڈبے میں کچھ رقم تھی۔ وہ ڈبا کہاں ہے؟"
"میں نے تو نہیں دیکھا جناب!" ارشد نے جواب دیا۔
مینیجر بولا: "میں یہاں آیا ہوں تو میز کی دراز کھلی پڑی تھی اور اس میں سے ڈبا غائب تھا۔ بات بہت بڑھ گئی ہے۔ اب ہمیں پولیس کو بلانا ہی پڑے گا۔"

"بہت بہتر جناب!" ارشد نے کہا "میں ابھی پولیس ہیڈ کوارٹر فون کیے دیتا ہوں۔"

اور وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھ گیا۔

سہ پہر کے قریب انسپکٹر حمید اور میں اس جگہ پہنچے جہاں عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ مینیجر نے کہا:

"دیکھیے، انسپکٹر صاحب! میں کل شام رقم والا ڈبّا اپنی میز کی دراز میں بند کر کے گیا تھا۔ آج صبح جب میں اپنے دفتر آیا تو میز کی دراز کھلی تھی اور اس میں سے ڈبّا غائب تھا۔"

"ڈبّے میں کیا تھا؟"

"ڈیڑھ ہزار روپے کے قریب۔"

"کوئی اور چیز بھی گم ہوئی ہے؟" انسپکٹر حمید بولے۔

"نہیں جناب۔ صرف ڈبّا اور رقم۔"

انسپکٹر حمید نے پوچھا: "کیا کسی اور شخص کے پاس بھی میز کی دراز کی چابی ہے؟"

جی نہیں۔" منیجر نے جواب دیا۔" اور یہ دفترات کو بند رہتے ہیں۔ کسی کے
اندر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
انسپکٹر حمید منیجر کے دفتر کا جائزہ لینے لگا۔ میں ساتھ کے کمروں کو دیکھنے
لگا۔ کچھ دیر تک ہر چیز کو غور سے دیکھنے کے بعد انسپکٹر حمید کہنے لگے :
" جس کسی نے بھی اس دراز کو کھولا ہے، اس نے چابی استعمال
نہیں کی۔"
" اچھا!" منیجر نے حیرانی سے کہا۔" تو پھر اس نے کیسے کھولا اسے ؟"
انسپکٹر حمید نے جواب دیا :" اس نے اسے چاقو کی مدد سے کھولا ہے
شاید چھوٹے سے جیبی چاقو کی مدد سے۔"
" آپ نے کیسے جان لیا جناب!؟" منیجر نے کہا۔
" اس طرح کرتے ہوئے چاقو کی نوک ٹوٹ گئی۔ چاقو کی یہ نوک یہاں
دراز کی لکڑی میں پھنسی ہوئی ہے۔"
انسپکٹر حمید نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکالا اور اس کی مدد سے
دراز میں پھنسی ہوئی چاقو کی نوک کو نکال لیا۔ پھر وہ بولے :
" یہ دیکھیے۔"
میں دفتر کے ساتھ کے کمروں کو دیکھ رہا تھا۔ دفتر کے پیچھے ایک
کمرے میں مجھے ایک چیز نظر آئی تو میں نے انسپکٹر حمید کو پکارا :
" حمید صاحب! ذرا ادھر آیئے۔ ایک نظر یہاں بھی ڈالیے۔"
انسپکٹر حمید بھاگم بھاگ آگئے اور بولے :" کیا ہے مسٹر ارسلان ؟"
میں نے انھیں باہر کی طرف کھلنے والی ایک کھڑکی دکھائی جو کھلی تھی۔ میں
نے کہا :
" میرا خیال ہے چور اس کھڑکی کے راستے اندر آیا تھا۔ اس نے باہر سے
یہ کھڑکی کھولی۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ وہ کس طرح اندر آیا ہوگا۔"
" تمھارا خیال بالکل صحیح ہے۔" انسپکٹر حمید نے کہا۔

"ایک چیز اور ہے جناب!" میں نے کہا "یہ دیکھیے کھڑکی میں کچھ نیلے دھاگے پھنسے ہوئے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ دھاگے چور کے کپڑوں کے ہوں؟"

انسپکٹر حمید نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے آگے بڑھ کر کھڑکی سے وہ دھاگے نکال لیے۔ پھر وہ کہنے لگے: "ان سے ہمیں تحقیق میں خاصی مدد ملے گی۔" انھوں نے نیلے دھاگوں اور چاقو کی ٹوٹی ہوئی نوک دونوں چیزوں کو حفاظت سے رکھ لیا اور پھر منیجر کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ میں بھی ساتھ ہی ہو لیا۔ منیجر کے دفتر میں پہنچتے ہی منیجر نے کہا:

"انسپکٹر صاحب! میں آپ کو یہاں کام کرنے والے ایک مزدور خالد کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

"کیا؟" انسپکٹر حمید نے پوچھا۔

"وہ یہاں کام کرتا تھا۔ کئی چھوٹی موٹی چیزیں یہاں سے چوری ہوتی رہی ہیں۔ کل رات اس نوجوان نے یہاں سے کچھ لکڑی چرائی تھی۔ ہمارے فورمین نے اپنی آنکھوں سے اسے لکڑی لے جاتے دیکھا ہے۔ میں نے پولیس کو بلانا مناسب نہیں سمجھا۔ بس اتنا کیا کہ اُسے کام سے نکال دیا۔ جاتے ہوئے اس نے مجھے یہ دھمکی دی تھی کہ تمھیں اس پر پچھتانا پڑے گا۔"

"اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟" انسپکٹر حمید بولے۔

"یہی آپ کو معلوم کرنا ہے جناب!" منیجر نے کہا "یہی آپ کا فرض ہے"۔

ارشد دروازے کے دوسری طرف کھڑا یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ انسپکٹر حمید اور منیجر کے درمیان ساری بات چیت وہ سن چکا تو وہ دفتر سے نکلا اور اس مکان کا رُخ کیا جہاں وہ اور خالد رہتے تھے۔ وہ خالد کے کمرے میں گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خالد وہاں بڑے آرام سے بیٹھا ہے۔ اس نے کہا:

"ارے خالد! تم یہاں بیٹھے ہو اور وہاں معاملہ کیا سے کیا ہو گیا ہے۔"

"کیا ہوا؟" خالد نے پوچھا۔

"کل رات کسی چور نے دفتر میں گھس کر منیجر کی میز کی دراز سے ایک ڈبہ چوری کر لیا۔ اس ڈبے میں ڈیڑھ ہزار روپے کی رقم تھی۔"

"اوہ!" خالد نے کہا۔ "لیکن تم میری طرف اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں چور تو نہیں۔"

ارشد نے کہا: "لیکن منیجر تمھیں ہی چور سمجھتا ہے۔ اس نے پولیس کو تمھارے بارے میں ساری بات بتا دی ہے۔ پولیس والے بس تمھیں گرفتار کرنے آتے ہی ہوں گے۔ اب تم کیا کرو گے؟"

ارشد نے دوبارہ تعمیر ہونے والی عمارت کا رُخ کیا۔ وہاں انسپکٹر مجید دوسرے مزدوروں اور کاری گروں سے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں صادق اور حنیف بھی تھے۔ صادق نے کہا:

"میرے خیال میں تو خالد ہرگز چور نہیں ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" حنیف نے کہا۔ "ویسے اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میرے پاس کوئی رقم تو ہے نہیں کہ گھر بیٹھ کر آرام سے کھاتا رہوں۔"

ہم نے مزدوروں اور دوسرے لوگوں سے باتیں کرنے کے بعد اس مکان کا رُخ کیا جہاں خالد کرائے دار کے طور پر رہتا تھا۔ مکان کے مالک نے ہمیں وہ کمرہ دکھایا جہاں خالد رہتا تھا لیکن اب وہ کمرہ خالی تھا۔ خالد وہاں سے جا چکا تھا۔ اس کی چیزیں بھی کمرے میں موجود نہیں تھیں۔ مالک مکان نے کہا:

"خالد نے اپنا کرایہ ادا کر دیا تھا۔ پھر وہ اپنا ٹرنک لے کر یہاں سے چلا گیا۔"

انسپکٹر مجید نے کہا: "ہم تمام تھانوں کو اطلاع کر دیتے ہیں۔ وہ اتنی جلدی سے جا بھی کہاں سکتا ہے۔ جلد ہی ہم اُسے ڈھونڈ نکالیں گے۔"

خالد نے گاڑی پکڑی اور ایک دوسرے شہر جا پہنچا۔ وہاں وہ ایک چھوٹے سے ہوٹل میں گیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے ایک کلرک نے ایک رجسٹر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہاں اپنا نام لکھ کر دستخط کر دیجیے۔"

خالد نے رجسٹر میں اپنا نام لکھا: "ظہور احمد"۔
پھر اس نے ہوٹل میں اپنا ٹرنک رکھا اور شہر کی سیر کرنے کے لیے باہر چلا گیا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔
جب وہ ہوٹل میں واپس آیا تو ایک پولیس والا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ہوٹل کے کلرک نے اس سے کہا:
"میں نے تمھارے ٹرنک پر تمھارا نام دیکھا تھا۔ یہ نام خالد احمد تھا ظہور احمد نہیں۔ تم نے اپنا نام غلط کیوں بتایا؟"
پولیس والے نے کہا: "ہمیں خالد نام کے ایک نوجوان کی تلاش ہے، اور وہ یقیناً تم ہی ہو"
یہ کہتے ہوئے اس نے خالد کو گرفتار کر لیا۔

اگلی صبح انسپکٹر حمید کے دفتر میں آئے تو میں نے انھیں خوشخبری سنائی۔
خالد کا پتا چل گیا ہے جناب!"
"خوب، بہت خوب!" انسپکٹر حمید نے خوش ہو کر کہا "وہ تھا کہاں؟"
"ایک دوسرے شہر کے ہوٹل میں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس نے ہوٹل کے رجسٹر میں ایک فرضی نام لکھا تھا۔ ہوٹل والوں کو پتا چلا تو انھوں نے پولیس کو بلا لیا۔ وہ جلد ہی اُسے لے کر یہاں پہنچ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ اس کا ٹرنک بھی ہے۔"
"اور رقم؟" انسپکٹر حمید نے پوچھا۔
"رقم کوئی خاص تو نہیں تھی اس کے پاس۔ بس یہی دس پندرہ روپے۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ رقم اس نے خرچ کر ڈالی ہو یا کہیں اور چھپا دی ہو۔ اس کے سامان میں رقم والا ڈبا نہیں ملا۔"
"خیر۔" انسپکٹر حمید نے کہا۔ "اصل بات ہمیں معلوم ہو جائے گی۔"
پولیس کا ایک سپاہی خالد کو ساتھ لیے اسی شام انسپکٹر حمید کے

دفتر میں آپہنچے۔ انسپکٹر حمید نے ایک نظر اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر بولے: "اپنا کوٹ اُتار دو۔"

خالد نے اپنا کوٹ اُتار کر انسپکٹر حمید کی طرف بڑھا دیا۔ یہ کوٹ نیلے رنگ کا تھا۔ میں نے کہا: "دیکھیے حمید صاحب! اس کوٹ کا رنگ بالکل اُن دھاگوں جیسا ہے۔"

انسپکٹر حمید میری بات کا جواب دینے کی بجائے کوٹ کی جیبوں کی تلاشی لینے لگے۔ کوٹ کی ایک جیب سے انھیں چھوٹا سا جیبی چاقو مل گیا۔ انھوں نے اس چاقو کو کھول کر دیکھا۔ اس کی نوک ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ خالد سے کہنے لگے: "یہ تمھارا چاقو ہے؟"

"جی ہاں!" خالد نے جواب دیا۔ "میں اسے ہمیشہ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھتا ہوں۔"

"فی الحال ہم اس کوٹ اور چاقو دونوں چیزوں کو اپنے پاس رکھیں گے۔ ہمارے آدمی یہ بتا سکیں گے کہ آیا وہ دھاگے اس کوٹ کے ہیں اور آیا وہ ٹوٹی ہوئی نوک اسی چاقو کی ہے۔"

چاقو اور کوٹ کو حفاظت سے ایک سپاہی کے حوالے کرنے کے بعد انسپکٹر حمید نے خالد سے پوچھا: "کیا تم نے منیجر کی دراز سے رقم والا ڈبّا چرایا تھا؟"

"نہیں جناب!" خالد نے جواب دیا۔ "میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں جناب! آپ کو میری بات کا یقین کرنا چاہیے۔"

میں نے خالد کی طرف دیکھا۔ وہ یہ باتیں انسپکٹر حمید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ رہا تھا۔ انسپکٹر حمید نے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا: "تم نے منیجر سے یہ بات کہی تھی کہ تمھیں پچھتانا پڑے گا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟"

خالد نے نظریں جھکا لیں۔ پھر کہنے لگا: "مجھے نہیں معلوم جناب! وہ مجھ پر نکڑی چرانے کا الزام لگا رہے تھے جب کہ میں کسی چوری کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ انھوں نے بغیر کسی قصور کے مجھے کام سے نکال دیا تھا۔ میرا

دل یہ ضرور چاہتا تھا کہ وہ اپنی اس حرکت پر پچھتائیں لیکن میں نے اس کے لیے کچھ نہیں کیا۔ میں نے اُن کی رقم نہیں چرائی۔ میری بات کا یقین کریں جناب! میں نے اُن کی رقم نہیں چرائی۔ چرانا تو ایک طرف رہا، میں نے اُسے دیکھا تک نہیں۔"

انسپکٹر حمید چند لمحے تک خاموش رہے۔ پھر کہنے لگے:

"تو پھر تم یہاں سے بھاگ کیوں گئے تھے؟"

"میں بھاگا نہیں تھا جناب!" خالد نے کہا۔ "میں تو کام کی تلاش میں دوسرے شہر گیا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی جناب!"

"تو پھر تم نے ہوٹل کے رجسٹر میں اپنا فرضی نام کیوں لکھا؟"

"میں ڈر گیا تھا جناب!" خالد نے کہا "مجھے معلوم تھا کہ آپ لوگ میری تلاش میں ہیں۔ ارشد نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ میرا دوست ہے۔ ساتھ ہی کے کمرے میں رہتا ہے اور مینیجر کے دفتر میں کام کرتا ہے۔"

انسپکٹر حمید نے کہا: "اگر تم نے کوئی غلط کام کیا ہی نہیں تھا تو پھر ڈر کیوں رہے تھے؟"

خالد نے ایک بار پھر انسپکٹر حمید کی طرف دیکھا اور کہنے لگا: "مینیجر صاحب مجھے چور سمجھتے تھے۔ وہ میری بات کا یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھے۔ شاید آپ کو بھی میری بات کا یقین نہ آئے۔ اسی لیے میں ڈر رہا تھا۔"

انسپکٹر حمید اور خالد کے درمیان یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میں کوٹ اور چاقو لے کر وہاں پہنچا۔ ایک کاغذ میں نے انسپکٹر حمید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جناب! لیبارٹری سے ابھی کوٹ اور چاقو کے ساتھ یہ رپورٹ آئی ہے۔"

انسپکٹر حمید نے کاغذ پر لکھی ہوئی رپورٹ پڑھی۔ پھر خالد کی طرف دیکھتے ہوئے بولے: "ہمیں دفتر کی ایک کھڑکی میں پھنسے ہوئے چند نیلے دھاگے ملے تھے۔ وہ دھاگے تمھارے اسی کوٹ میں سے نکلے تھے۔ رپورٹ میں یہ بات لکھی ہے۔"

"نہیں جناب!" خالد تقریباً چیخ اٹھا "ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"ایک بات اور بھی ہے۔" انسپکٹر حمید نے کہا "وہ چاقو تمھارا ہی چاقو تھا جس کی نوک سیری کی دراز کھولتے ہوئے ٹوٹ کر وہاں پھنس گئی تھی۔"

خالد ایک لمحے خاموش کھڑا رہا۔ پھر نہایت سکون سے کہنے لگا:

"ٹھیک ہے جناب! آپ ایک بار نہیں ہزار بار اس کا یقین کریں لیکن میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں کہ میں چور نہیں ہوں۔"

"ہمیں جلد ہی اس کا پتا چل جائے گا۔" انسپکٹر حمید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تو کیا میں جا سکتا ہوں؟" خالد نے پوچھا

"نہیں۔" انسپکٹر حمید نے جواب میں کہا "تم نہیں جا سکتے۔ فی الحال تم ہمارے ہی پاس رہو گے۔" انھوں نے یہ کہتے ہوئے سپاہی کو اشارہ کیا۔ سپاہی خالد کو ساتھ لے کر حوالات کی طرف چلا گیا۔

انسپکٹر حمید بے چینی سے کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ میں نے کہا: "معاملہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ یہ تو چور کا پتا چل ہی گیا ہے۔"

"شاید۔" انسپکٹر حمید بولے۔ "خرابی صرف ایک ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

"مجھے اس کا یقین ہے"

"کیا!" میں نے حیرانی سے کہا "کس بات کا؟"

انسپکٹر حمید میری طرف مڑے اور بولے: "میرا خیال ہے کہ وہ سچ بول رہا ہے۔"

"لیکن وہ کوٹ تو اس کا تھا اور چاقو بھی!"

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔"

انسپکٹر حمید یہ کہتے ہوئے دوبارہ اپنی کرسی پر آ بیٹھے۔ ان کے اس رویے نے مجھے بھی الجھن میں ڈال دیا اور میں کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ انسپکٹر حمید کہنے لگے:

میں نے اس جیسے ہزاروں نوجوانوں سے گفتگو کی ہے۔ اُن میں سے بعض واقعی چور تھے لیکن سب کے سب نہیں۔ ایک وقت آتا ہے جب آدمی اپنے اندر کچھ محسوس کرتا ہے لیکن باہر کوئی بات نہیں ہوتی۔ کوئی ثبوت نہیں ہوتا، لیکن ہمارے اندر سے آواز آتی ہے کہ یہ آدمی جھوٹا نہیں ہے۔ یہ آدمی سچ بول رہا ہے۔ تمھیں خود بھی کئی بار ایسا اتفاق ہوا ہوگا۔

میں انسپکٹر حمید کی یہ باتیں سن کر کچھ اور حیران ہو گیا۔ کھڑکی سے جو نیٹ دھاگے ملے تھے، وہ خالد کے کوٹ کے تھے۔ میز کی دراز سے جو ٹوٹی ہوئی نوک ملی تھی، وہ خالد کے چاقو کی تھی۔ بظاہر سارے ثبوت خالد کے خلاف تھے لیکن انسپکٹر حمید کو یقین تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔ چوری اس نے نہیں کی۔ میں اُن کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا: "اب آپ کیا کریں گے؟"

"میں اس معاملے کو پھر سے شروع کروں گا۔ شروع سے۔ پہلی سیڑھی سے۔"

"میں کچھ نہیں سمجھا جناب!" میں نے کہا۔

"دیکھتے جاؤ۔" انسپکٹر حمید بولے "سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔"

مینجر اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ ارشد اندر داخل ہوا اور اس نے انسپکٹر حمید کے آنے کی اطلاع دی۔ مینجر نے کہا: "انھیں اندر لے آؤ۔"

انسپکٹر حمید مینجر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ مینجر نے اُٹھ کر اُن سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا:

"کیوں جناب! کیا آپ نے چور کو پکڑ لیا ہے؟"

انسپکٹر حمید بولے: "ہم نے خالد کو پکڑا ہوا ہے، اگر وہ چور ہے تو!"

مینجر بولا: "یہ اگر مگر کیا ہوئی جناب! چور تو وہی ہے!"

انسپکٹر حمید ایک لمحے کے لیے خاموش رہے، پھر بولے:

"میں ایک بات اب تک نہیں سمجھ سکا مینجر صاحب! چور نے صرف آپ ہی کی میز کا رُخ کیوں کیا۔ کسی اور کی طرف کیوں نہیں گیا؟"

"وجہ تو صاف ظاہر ہے جناب!" مینجر بولا۔ "میز کی دراز میں رقم جو تھی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" انسپکٹر حمید بولے۔ "مگر خالد تو وہاں مزدوروں کے ساتھ کام کرتا رہا ہے۔ اسے یہ کیسے پتا چلا کہ آپ رقم اپنی میز کی دراز میں رکھتے ہیں؟"

منیجر کے جواب کا انتظار کیے بغیر انسپکٹر حمید نے کہا: "میں آپ کے فورمین سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

منیجر نے اسی وقت ارشد کو طلب کیا اور کہا: "فورمین سے کہو کہ فوراً یہاں آئے۔" ارشد فورمین کو بلانے چلا گیا تو منیجر کہنے لگا: "یہاں چھوٹی موٹی کئی چوریاں ہو رہی ہیں۔ اس لیے میں نے فورمین کو ذرا نگاہ رکھنے کے لیے کہا تھا۔ کل اس نے ایک جگہ چھپ کر دیکھا کہ خالد عمارت سے کچھ لکڑی لیے جا رہا ہے۔"

اتنے میں فورمین دفتر میں آ گیا۔ انسپکٹر حمید نے اس سے پوچھا: "کیا جب تم نے خالد کو دیکھا تو اس وقت اندھیرا تھا؟"

"بالکل اندھیرا تھا جناب!" فورمین نے جواب دیا۔

انسپکٹر حمید نے پوچھا: "تو پھر تم نے اسے کیسے پہچانا؟"

"اس کے کوٹ سے جناب!" فورمین نے جواب دیا۔ "اس نے نیلا کوٹ پہنا ہوا تھا اور یہاں جتنے لوگ بھی کام کرتے ہیں اُن میں سوائے خالد کے اور کسی کے پاس نیلا کوٹ نہیں ہے۔"

جب وہ یہ باتیں کر رہے تھے تو باتیں کرتے کرتے انسپکٹر حمید خاموشی سے دفتر کے دروازے کے قریب پہنچ گئے اور پھر اچانک دروازہ کھول دیا۔ ارشد دروازے کے باہر تالے کے سوراخ سے کان لگائے، اندر ہونے والی باتوں کو سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" انسپکٹر حمید نے کسی قدر سختی کے ساتھ پوچھا۔

ارشد دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "کچھ نہیں ــــ کچھ نہیں جناب! میں تو ــــ میں تو ــــ میں معافی چاہتا ہوں جناب!"

انسپکٹر حمید نے دروازہ دوبارہ بند کر دیا اور پھر منیجر سے مخاطب ہوئے:

"آپ کے دفتر کے ساتھ جو دفتر ہے اس میں کتنے آدمی کام کرتے ہیں؟"
"وہاں صرف ارشد کام کرتا ہے جناب!" مینیجر نے جواب دیا۔
"اور وہ رہتا کہاں ہے؟" انسپکٹر حمید نے پوچھا۔
مینیجر نے جواب دیا: "اس مکان میں جہاں خالد کی رہائش تھی۔ وہاں دونوں نے ایک ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ خالد اور ارشد کے کمرے ساتھ ساتھ ہی ہیں۔"

اُس رات جب ارشد اپنے کمرے میں واپس پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ خالد وہاں پہلے سے موجود ہے۔ وہ حیران ہو کر بولا: "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"
"تمھارا انتظار"۔ خالد نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔
"کیا تمھیں پولیس نے حوالات میں نہیں رکھا؟"
"نہیں"۔ خالد نے جواب دیا۔ "انھوں نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔"
"لیکن ------" ارشد نے رُکتے رُکتے کہا: "وہ رقم تو تم نے چُرائی تھی۔"
"نہیں میرے دوست!" خالد نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "وہ رقم چُرانے والا میں نہیں تھا۔ وہ تو کوئی ایسا آدمی ہے جو مینیجر کے ساتھ دفتر میں کام کرتا ہے ------ وہ تو ایسا آدمی ہے جسے علم ہے کہ مینیجر اپنی میز کی دراز میں رقم رکھتا ہے۔"
"کیا مطلب ہے تمھارا؟" ارشد نے حیران ہو کر کہا۔
"مطلب یہ کہ وہ تم تھے ارشد!" خالد نے کہا۔ "تم ہی تھے جس نے رقم والا ڈبّا اُٹھایا تھا۔"
"تم مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔" ارشد نے غصّے سے کہا "نکل جاؤ یہاں سے۔ اسی وقت نکل جاؤ۔"

خالد ہنس دیا اور بڑے اطمینان سے کہنے لگا: "میں یہاں سے چلا جاؤں گا مگر ابھی نہیں۔ پہلے مجھے ایک بات پوری کر لینے دو۔ جس شخص نے عمارت سے لکڑی چرائی وہ بھی تم ہی تھے۔"

ارشد غصے میں آ کر ہنس دیا۔ وہ بولا: "تمھارا دماغ چل گیا ہے شاید۔ سب کو معلوم ہے کہ لکڑی چرانے والے تم تھے۔ فورمین نے تمھیں دیکھا تھا۔"

"نہیں میرے دوست!" خالد نے کہا: "فورمین نے مجھے نہیں، صرف میرے کوٹ کو دیکھا تھا۔ وہاں سے تم نے جب بھی کوئی چیز چرائی، پہلے تم میرے کمرے میں آئے۔ تم میرا کوٹ اسی وقت لے جاتے تھے جب میں سو رہا ہوتا تھا۔ ایسے میں اگر کوئی آدمی دیکھتا بھی تو یہی سمجھتا کہ چوری کرنے والا ارشد نہیں خالد ہے۔ تم نے پولیس کے بارے میں بھی مجھے اسی لیے بتایا تھا کہ تم چاہتے تھے کہ میں یہاں سے بھاگ جاؤں اور پولیس میرے پیچھے لگ جائے۔"

ارشد مسکراتے ہوئے بولا: "چلو مان لیا کہ تمھاری بات ٹھیک ہے۔ میں نے ہی چرائی تھی، میں ہی لکڑی چراتا رہا تھا۔ ایک بار نہیں کئی بار۔ لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ کون تمھاری بات مانے گا؟"

"انسپکٹر حمید میری بات مانیں گے۔" خالد نے کہا۔ "ارسلان کو میری بات کا یقین آ جائے گا۔"

"کیوں؟"

خالد ہنس دیا: "اس لیے کہ اس وقت وہ دونوں ہماری باتیں سن رہے ہیں۔"

ارشد گھبرا کر ایک دم دروازے کی طرف لپکا۔ عین اسی لمحے دروازہ کھلا۔ ہی اور انسپکٹر حمید باہر کھڑے خالد اور ارشد کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو سن رہے تھے۔ وہ اندر داخل ہوئے۔ انسپکٹر حمید نے کہا:

"شاباش مسٹر خالد! تمھاری مدد سے ہم نے اس معاملے کی ساری گتھی

کو سمجھا لیا ہے۔"

میں نے ارشد کے کمرے کی تلاشی لی تو رقم کا ڈبا اس کے پلنگ کے نیچے چھپا ہوا ملا۔ ڈیڑھ ہزار روپے کی پوری کی پوری رقم اس کے اندر موجود تھی۔

"میں نے یہ رقم نہیں چرائی جناب!" ارشد انسپکٹر حمید کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ خالد کی شرارت ہے جناب! ڈبا اس نے چرایا اور پھر مجھے پھنسانے کے لیے میرے کمرے میں لاکر چھپا دیا۔ مجھے تو اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا جناب!"

انسپکٹر حمید نے میری طرف دیکھا اور بولے:

"دیکھا! انکار انکار میں کتنا فرق ہوتا ہے ـــــ یہ ہے وہ آدمی جو واقعی چور ہے۔"

ہم ارشد کو گرفتار کر کے رقم کے ڈبے سمیت پولیس ہیڈ کوارٹر کی طرف چل دیے۔ ارشد برابر یہی کہے جا رہا تھا:

"میں چور نہیں ہوں! میں چور نہیں ہوں!"

لیکن اس کا چہرہ اس کی بات کو جھٹلا رہا تھا۔ انسپکٹر حمید ہی کو نہیں، مجھے بھی علم ہو چکا تھا کہ انکار انکار میں کتنا فرق ہوتا ہے۔

٭٭٭

(اس کہانی کا خیال ایک انگریزی کہانی سے لیا گیا ہے)

ایک دفعہ شیر نے سب جانوروں کو بلایا اور کہا "بتاؤ جنگل کا بادشاہ کون ہے؟" سب جانوروں نے باری باری کہا "آپ جنگل کے بادشاہ ہیں۔" جب ہاتھی کی باری آئی اس نے شیر کو ٹکر ماری۔ شیر دور جا گرا لیکن اٹھتے ہی بولا "اگر پتا نہیں تھا تو کسی سے پوچھ لیتے۔ یہ سر پٹخنے کی کیا ضرورت تھی۔" بشارت محمود (راولپنڈی)

ابھی گُگّو کے بھیا لائے ہیں بازار سے ڈُم ڈُم

وہ چلتی ہے تو اس کا ہارن بجتا ہے پپاں پم پم

پھلوں میں آم اور انگور اس کو اچھے لگتے ہیں

مٹھائی بھی پسند اُس کو ہیں میسُو، برفی اور چم چم

ابھی گُگّو بہت چھوٹا ہے پھر بھی پڑھتا رہتا ہے

شرارت بھی کبھی کرتا ہے وہ لیکن بہت کم کم

کبھی جب مُوڈ میں ہو تو وہ ہاتھی بن کے چلتا ہے

ذرا آہستہ، ذرا کم کم، ذرا تھم تھم

وہ خوش ہوتا ہے جب بھی گرمیوں میں بارش آجائے

چھما چھم چھم، چھما چھم چھم، چھما چھم چھم، چھما چھم چھم

جب اُس کے دوست آتے ہیں تو سب مل کر کھیلتے ہیں

دھما دھم دھم، دھما دھم دھم، دھما دھم دھم، دھما دھم دھم

نئے لفظوں کے معنی پُوچھتا رہتا ہے وہ مجھ سے

ابھی کل کہہ رہا تھا ابُّو جی! ہوتا ہے کیا زم زم

وہ میلے پر گیا تو ڈھول کی آواز پر خوش تھا

ڈما ڈم ڈم، ڈما ڈم ڈم، ڈما ڈم ڈم، ڈما ڈم ڈم

وہ ٹی وی پر "علی بابا" ڈراما دیکھ کر بزمی

مرے کمرے کے دروازے پہ کہتا ہے کہ "کھُل سم سم"

بزمی

شاذیہ کی نئی سہیلی

کشور سلطانہ

شاذیہ اپنی امّی اور ابّو کے
ساتھ ایک خوب صورت سے مکان میں رہتی تھی۔
شاذیہ کے ابا سرکاری ملازم تھے۔ شاذیہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی
اور قریب ہی ایک سکول میں پڑھتی تھی۔ گھر میں اور کوئی چھوٹا بچہ
نہیں تھا، اس لیے والدین کی تمام توجہ شاذیہ ہی پر تھی۔ ہر وقت بڑوں
کی صحبت میں رہ کر یہ بچی اپنی عمر سے بڑی، سمجھ دار اور سنجیدہ ہو گئی تھی۔
شاذیہ کے پڑوس والے مکان میں بھی اس کی ہم عمر ایک بچی عروج
رہتی تھی۔ عروج سے شاذیہ کی بہت گہری دوستی تھی۔ شام کے وقت شاذیہ

اور عروج اکٹھا وقت گزارتیں، کھیلتیں کودتیں اور اکٹھے ہی شاذیہ کے ابّا اور امّی کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے جاتی تھیں۔

یوں شاذیہ کا وقت اچھا گزر رہا تھا۔ لیکن ایک دن شاذیہ کے ابّا نے بتایا کہ اُن کا تبادلہ ہو گیا ہے اور انھیں لاہور جلد ہی چھوڑنا پڑے گا۔

شاذیہ بولی : "ابّا! اب ہم کہاں جائیں گے ؟"

"بیٹی! ہمارا تبادلہ کراچی ہوا ہے۔ ہم سب وہیں شفٹ ہو جائیں گے۔" اس کے ابّا نے جواب دیا۔

کراچی کے نام پر شاذیہ کو خوشی ہوئی کہ چلو اس بہانے ہم کراچی بھی دیکھ لیں گے اور سمندر کی سیر بھی کریں گے۔

وقت گزرتا گیا۔ آخر لاہور چھوڑنے کا دن بھی آ گیا اور یہ لوگ کراچی جانے کی تیاری کرنے لگے۔

روانہ ہونے سے پہلے شاذیہ، عروج کی وجہ سے بہت غمگین تھی۔ بار بار اس سے ملتی اور پھر ابّا سے پوچھتی : ابّا! ہم اب عروج سے کیسے ملا کریں گے؟ ابّا نے بچی کی ذہنی کیفیت محسوس کرتے ہوئے اُسے سمجھایا، دیکھو بیٹا! زندگی میں بے شمار تبدیلیاں آتی ہیں۔ کچھ چھوڑ کر ہم کچھ پاتے ہیں۔ بے شک تمھیں عروج کو چھوڑنے کا رنج ہے۔ لیکن اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ اور یہ ہو سکتا ہے تمھیں وہاں بھی کوئی عروج جیسی سہیلی مل جائے۔ دل تو ہمارا بھی اداس ہے مگر جہاں انسان کی روزی ہے، وہیں اس کا سب کچھ ہے۔ اب تم پریشان مت ہو۔ چلو شاباش! اٹھو اور ایک الوداعی ملاقات عروج سے کر لو لیکن خوشی خوشی جیسے ہم اپنے دوستوں سے ملتے ہیں۔

ابّا کی باتوں سے شاذیہ کا غم کچھ ہلکا ہو گیا۔ بچی تھی، خوشی خوشی تیاری میں مصروف ہو گئی۔

شام کو چار بجے والی ٹرین سے یہ لوگ کراچی کے لیے روانہ ہو گئے۔

کراچی جا کر شاذیہ کے ابّا نے شمالی ناظم آباد میں خوب صورت سا فلیٹ لیا

اور دونوں میاں بیوی نئے گھر کی سیٹنگ میں مصروف ہو گئے۔
کچھ دن تو بہت ہی مصروفیت رہی۔ کبھی بازار جانا ہوتا اور کبھی گھر کو سجانے میں وقت کٹتا رہا۔ آخر جب یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا اور شاذیہ کے ابا نے بھی باقاعدہ دفتر جانا شروع کر دیا تو شاذیہ کو تنہائی کا احساس ہوا۔ اب اسے رہ رہ کر عروج یاد آتی۔ روز بروز یہ احساس بڑھتا گیا اور شاذیہ انتہائی اداس رہنے لگی۔
ایک دن شاذیہ کے ابا نے شاذیہ سے پوچھا: "معلوم ہوتا ہے، ہماری بٹیا کا دل ابھی تک نہیں لگا۔" ابا کے منھ سے پیار کے یہ الفاظ سن کر شاذیہ

کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آواز حلق میں اٹک گئی۔ ابا اٹھے اور شاذیہ کو سینے سے لگایا تو شاذیہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔
جب خوب دل کی بھڑاس نکل گئی تو وہ روتے روتے بولی: "ابا! آپ نے ہمیں یہاں لا کر اچھا نہیں کیا۔ ہم سے وقت نہیں کٹتا کیونکہ جب سے ہم یہاں آئے ہیں، ہمارے گھر کوئی نہیں آیا۔"

"ارے ارے، بس اتنی سی بات ہے۔ ابھی ہم لوگ نئے نئے آئے ہیں۔ کسی سے جان پہچان نہیں ہے۔ ویسے بھی کراچی میں لوگ زیادہ مصروف ہیں۔ اور ہاں، ایک غلطی ہم سے ہوئی ہے کہ ہم نے اپنی بٹیا کو سیر نہیں کرائی۔ ہم بھی مصروف تھے۔ چلو آج اپنی بٹیا کو سمندر کی سیر کراتے ہیں۔ چلو، بس رونا دھونا بند کرو اور تیار ہو جاؤ۔" ابا نے دلاسا دیا۔

شازیہ بے دلی سے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنی امی کے پاس آئی اور بولی:

"امی جان! جلدی سے تیار ہو جائیے۔ ابا ہمیں سیر کرانے لے جا رہے ہیں۔"

امی نے خوش ہو کر کہا: "واہ بھئی واہ! آج بہت اچھا دن ہے کہ تمہارے ابا کو فرصت تو ملی۔"

کچھ دیر بعد تینوں سمندر کے کنارے پر پہنچ گئے۔ شازیہ اپنی امی اور ابا کے پاس بیٹھی سمندر کی آتی جاتی لہروں کو دیکھتی رہی اور گہری سوچ میں ڈوبی رہی۔ شاید یہاں بھی اسے عروج کا خیال آ رہا تھا۔ پھر ایک دم وہ ابا سے بولی: "ابا جان! میں ذرا آگے جا کر گھوم لوں۔"

ہاں ہاں بیٹا! تم آزادی سے گھومو۔ ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ بہت آگے تک نہ جانا کیونکہ پانی کی لہر ایک دم آتی ہے اور اپنے ساتھ ہی بہا کر لے جاتی ہے۔ ذرا ہوشیاری سے ہاں۔۔۔۔۔ جاؤ شاباش، گھومو۔"

شازیہ ذرا سا آگے بڑھی اور کچھ فاصلے پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ اچانک ایک بڑی سی لہر آئی اور اس لہر کے ساتھ ایک بوتل اچھل کر شازیہ کے پاس آ کر گری۔ شازیہ نے غیر ارادی طور پر بوتل کو اٹھا لیا۔ بوتل خالی تھی۔ شازیہ کچھ لمحوں تک خالی بوتل کو دیکھتی رہی۔ پھر نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ وہ اپنی امی کے پاس آئی اور اس نے ان سے کاغذ اور قلم مانگا۔ امی

نے بیگ میں سے ایک قلم اور چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا نکال کر دیا۔
شازیہ پھر واپس اسی جگہ آگئی اور ایک جگہ بیٹھ کر کاغذ پر یہ تحریر لکھی :

"میرا نام شازیہ ہے۔ میں حال ہی میں لاہور سے کراچی اپنے ابّا اور امّی کے ساتھ آئی ہوں۔ لیکن میں بہت پریشان ہوں کیونکہ میری کوئی سہیلی نہیں ہے۔ میری سہیلی عروج لاہور میں ہے۔ ہمارے درمیان بہت فاصلہ ہے۔ ہم ایک دوسرے کو نہیں مل سکتے۔ اگر کوئی لڑکی میری سہیلی بننا پسند کرے تو میں بہت شکر گزار ہوں گی۔ میرا پتا یہ ہے :

فلیٹ نمبر ۷/2 سہیل اپارٹمنٹ بلاک نمبر I نارتھ ناظم آباد
کراچی نمبر 33۔"

یہ لکھ کر شازیہ نے کاغذ کی تہ بنائی اور بوتل کا کارک کھولا۔ پھر اس تہ شدہ کاغذ کو بوتل میں ڈالا اور کارک لگا دیا۔ پھر بوتل کو پوری طاقت سے اُچھال کر سمندر میں پھینک دیا اور خود ہی خود مسکرانے لگی۔

وہ دیر تک سمندر کو دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد واپس مڑی اور اپنی امّی کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

اتنے میں شام ہو گئی۔ ابّو بولے، چلو واپس چلتے ہیں۔ تینوں آ گے

اتنے میں آئس کریم والا سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ تینوں نے آئس کریم کھائی

اور واپس گھر آ گئے۔

دن گزرتے گئے اور شاذیہ بھی اس واقعے کو بھول گئی۔ ایک دن شاذیہ

کی امّی باورچی خانے میں کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ شاذیہ اپنے

بیڈ روم میں بیٹھی کھلونوں سے کھیل رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ شاذیہ

نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک چھوٹی بچی اور ایک آدمی کھڑے تھے۔

شاذیہ : آپ کو کس سے ملنا ہے ؟

اجنبی : کیا آپ کا نام شاذیہ ہے ؟

شاذیہ : جی ہاں! لیکن آپ لوگ کون ہیں اور میرا نام کیسے جانتے ہیں ؟

اجنبی مسکرا کر آگے بڑھا اور اس نے شاذیہ کو گود میں اٹھا لیا، پھر بولے :

"بیٹے! آپ تو بہت ہی عقلمند ہیں، اور دیکھو ہم آپ کے لیے آپ کی سہیلی کو لے کر آئے ہیں۔ ان سے ملئے یہ ہیں آپ کی نئی سہیلی مہوش۔"

شاذیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دونوں کو دیکھنے لگی۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ اتنے میں شاذیہ کی امّی بھی آ گئیں۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ کر حیران ہوئیں۔ اجنبی آدمی نے ان کو نہایت ادب سے سلام کیا اور اپنا مکمل تعارف کرایا۔ شاذیہ کی امّی نے جلدی سے انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

آنے والے شخص نے بتایا کہ وہ کراچی ہی کے رہنے والے ہیں اور سمندری جہاز میں ملازم ہیں۔ ایک دن وہ سمندر کے ساحل کی سیر کو آئے۔ ان کے ساتھ ان کی بچی مہوش بھی تھی۔ وہ لوگ کھڑے سمندر کو دیکھ رہے تھے کہ ایک لہر آئی اور ایک بوتل اچھل کر ان کے پیروں میں آ گری۔ مہوش نے بوتل اٹھائی تو اس میں سے کاغذ کا ٹکڑا نکلا جس پر شاذیہ کی تحریر تھی

انھوں نے وہ تحریر شاذیہ کی امّی کو دکھائی۔
کہنے لگے کہ تحریر میں اتنی سچائی اور خلوص تھا کہ مہوش کو اور مجھے بھی شاذیہ سے ملنے کا شوق ہوا اور ہم آپ کے گھر چلے آئے۔ مہوش نے اسی وقت دل سے شاذیہ کو سہیلی مان لیا اور اب یہ دونوں آپس میں سہیلیاں ہیں۔
شاذیہ کی امّی اپنی بیٹی کی ذہانت پر بہت خوش ہوئیں اور اٹھ کر مہوش کو بھی پیار کیا۔ اتنے میں شاذیہ کے ابو بھی آ گئے۔
اس طرح یہ سب لوگ دوستی کے گہرے رشتے میں شامل ہو گئے۔
شاذیہ کا تو مزاج ہی بدل گیا کیونکہ اب اسے ایک نئی سہیلی مل گئی تھی۔

ایڑی چوٹی کا زور

ایک خاتون کا قد بہت چھوٹا تھا۔ اس نے ایک تقریب میں شرکت کے لیے یہ ترکیب سوچی کہ بال اس طرح بنائے جیسے اونٹ کا کوہان ابھرا ہوتا ہے اور اونچی ایڑی والے سینڈل پہنے۔
تقریب میں ایک شریر لڑکی نے اس خاتون کو دیکھ کر کہا: "واہ! آج تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔ آپ نے لمبی ہونے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔"

محمد رفیق (لاہور)

کرتے ہو تم خُوب شرارت کس درجہ ہے بُری یہ عادت
پٹ جاؤ گے مجھ سے اک دن سب جاؤ گے بھُول
بن جاؤ معقول

پڑھنے لکھنے سے بیزاری صُحبت بھی ہے بُری تمھاری
کچھ بھی نہیں ہے تم کو مطلب گھر ہو یا اِسکول
بن جاؤ معقول

ہر اک سے بس یُوں ہی لڑنا ہر دم اپنی ضِد پر اَڑنا
جو بھی بات تمھاری ہے وہ بے کار اور فضول!
بن جاؤ معقول

پھرتے رہتے ہو آوارہ! کوئی تو ہو اس کا چارہ
دیر سے گھر کو واپس آنا روز کا ہے معمُول
بن جاؤ معقول

اور زیادہ کچھ مت بولو مُنھ اپنا اب اور نہ کھولو
ہو جاؤ خاموش اسی وقت بات کو مت دو طُول
بن جاؤ معقول

بُرائی کا راستہ

عافیہ بزمی (لاہور)

شادمان کے خوب صورت اور وسیع علاقے میں کون تھا جو سیٹھ عبید کو نہیں جانتا تھا۔ نام کا تو وہ سیٹھ تھا لیکن تھا شہر کا بدنام بدمعاش۔ شہر کا بچہ بچہ اس کے نام سے خوف کھاتا تھا۔ اس کی شکل بہت ڈراؤنی تھی۔ دراصل بچپن میں اس کے باپ کے دشمنوں نے رات کو ان کے گھر آگ لگا دی تھی جس میں اس کا سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ اس کے ماں باپ، بہن بھائی، جائداد، نقدی سب کچھ تو ختم ہو گیا تھا، صرف عبید تھا جو زندہ بچا۔ وہ بھی اس لیے کہ آگ کے خوف سے اس نے اپنے آپ کو لحاف میں لپیٹ لیا تھا لیکن اس کے باوجود اُس کا چہرہ آگ سے جھلس گیا تھا۔ تب سے اس کے کچے ذہن نے اپنے باپ کے دشمنوں سے بدلہ لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

اس کے باپ کے دشمن اس وجہ ان کے دشمن بن گئے تھے کہ عبید کے دادا نے اس چوری کے زمیندار کے بڑے بیٹے وسیم کو قتل کروا دیا تھا۔ بات صرف یہی کہ وسیم کو بیٹا گھوڑ سواری کے شوق میں عبید کے دادا کے کھیت میں آ گیا جس پر عبید کے دادا نے طیش میں آکر وسیم کو قتل کر دیا۔ تب وسیم کو بھائی فرغِ انتقام کی آگ میں بھڑک رہا تھا۔ آخر ایک دن موقع پاکر اس نے عبید کے گھر کو آگ لگا دی جس کے نتیجے میں عبید کا سب کچھ ختم ہو گیا اور وہ اپنے باپ کے دشمنوں سے بدلہ لینے کی خاطر شہر کا بدمعاش بن گیا۔ جگہ جگہ چوری اور ڈاکے کی وارداتیں ہونے لگیں اور وہ سب وارداتیں کروانے والا عبید ہی تھا۔

بچے جب اسے دیکھتے تو ایسے بھاگتے کہ جیسے کوئی اور ہی مخلوق زمین پر اتر آئی ہو۔ باہر کے بچے تو الگ رہے جب وہ گھر آتا تو اس کے اپنے بچے کونوں کھدروں میں جا چھپتے جیسے انہیں سانپ سونگھ لیا ہو عبید جب بولتا تو اس کی آواز اتنی گرج دار ہوتی کہ بڑے بڑوں کے دل دہل جاتے۔

عبید ٹیلی فون بند کر کے ہی آ رہا تھا۔ آج اس نے اپنے گروہ کو بینک میں ڈاکا ڈالنے کا حکم دیا تھا رات ڈیڑھ بجے جب تمام شہر نیند کی آغوش میں تھا، عبید اور اس کے ساتھی بڑی تیزی سے بینک کی طرف جا رہے تھے۔ ان کی جیپ بینک کے قریب جا کر رکی اندر انھوں نے آگے چلنا شروع کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے چوکیدار کا کام تمام کیا۔ اسے نشہ آور دوا کھلائی، رسیوں سے باندھ کر کونے میں ڈال دیا اور اس کے منہ میں رومال ٹھونس دیا تاکہ وہ شور نہ کر سکے۔ پھر اندر جا کر چار لاکھ روپے نکالے اور فرار ہو گئے۔ عبید کا سارا گروہ اپنی کامیابی پر خوش تھا۔

دوسرے دن اخبار میں سب سے اوپر یہی خبر تھی "شادمان" کے قریب بینک کی شاخ میں چار لاکھ کا ڈاکا۔ پولیس ملزموں کو نہ پکڑ سکی،

اور ملزم فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔" خبر پڑھ کر عبید نے طنزیہ قہقہہ لگایا۔ شب و روز اسی طرح گزرنے لگے۔ نئی سے نئی وارداتیں ہوتیں لیکن پولیس عبید کے گروہ کا سراغ نہ لگا سکی۔

ایک دن عبید اپنی گاڑی میں کہیں جا رہا تھا۔ اچانک اس نے بچے کو دیکھا جو سکول یونیفارم پہنے تھا۔ عبید کو وہ بچہ بالکل اپنے بچے جیسا لگا۔ وہ بچہ سڑک پار کرنا چاہتا تھا لیکن ٹریفک اتنی زیادہ تھی کہ وہ ننھا منا بچہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس وقت عبید کے دل کے جانے کون سے گوشے میں اتنی محبت آ گئی کہ اس کا دل چاہا کہ اس بچے کو گود میں اٹھا لے اور اسے اتنا پیار کرے کہ وہ بچہ دنیا و جہان کو چھوڑ کر اس کی بانہوں میں آ جائے۔ بے اختیار ہو کر جب وہ بچے کے قریب پہنچا تو بچہ جس کا نام یاسر تھا اسے دیکھ کر بہت خوف زدہ ہوا۔ اُسے اس کی شکل بہت بھیانک سی لگی۔

لیکن جب عبید نے اسے پیار سے بلایا اور سڑک پار کرانے کا
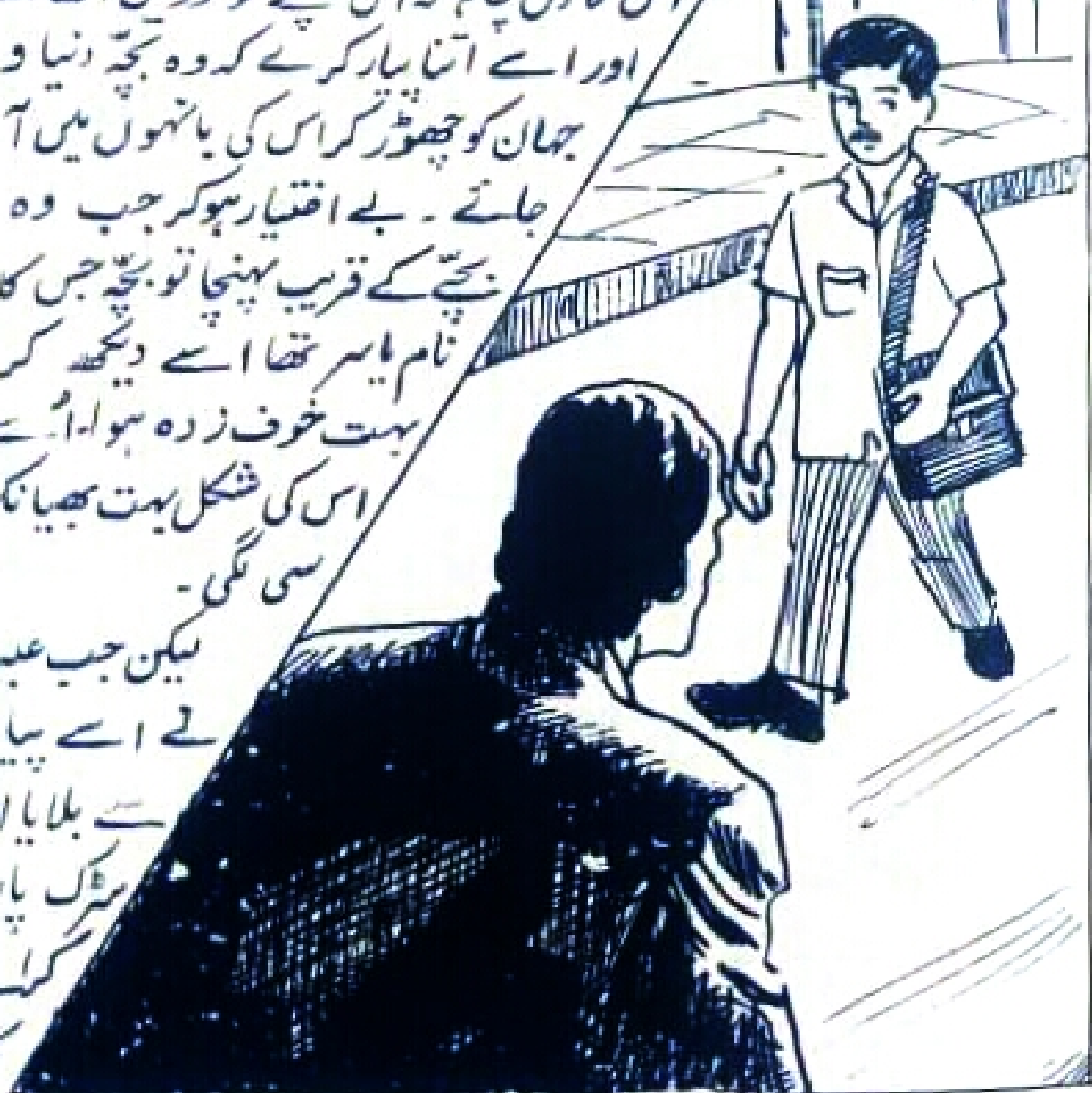
وعدہ کیا تو وہ بچہ اس کے قریب آگیا۔ اب تو عبید کا معمول بن گیا کہ ہر روز وہ اس بچے سے ملنے جاتا۔ ایک دن بچے کے اصرار پر وہ اس کے گھر چلا گیا۔ باہر ڈرائنگ روم میں اسے بٹھا کر بچہ اندر گیا۔ اس نے اٹھ کر کمرے کا جائزہ لیا۔ سامنے لگی تصویر دیکھ کر اُسے کچھ جانی پہچانی لگی۔ اس نے ذہن پر زور دیا اور کچھ ماضی کی بھُول بھلیوں میں کھو گیا۔ یہ تصویر اس کے دشمن فرخ کی تھی جس نے آج اس کی شکل کو اتنا بدصورت بنا ڈالا تھا کہ وہ خود بھی آئینہ دیکھتے ہوئے گھبراتا تھا۔

چند لمحے بعد یاسر کمرے میں داخل ہوا۔ عبید نے اپنی تلخی چھُپاتے ہوئے ظاہری محبت سے اس سے پوچھا: "بیٹا! یہ تصویر کس کی ہے؟" یاسر نے کہا" انکل جان! یہ میرے ابّو ہیں۔" اتنا سننا تھا کہ عبید کا دل چاہا کہ یاسر کو اٹھا کر بھاگ جائے۔ اگر وہ چاہتا تو ایسا کر بھی سکتا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے یاسر میں اپنے بیٹے کی شکل دکھائی دی اور وہ چُپ چاپ نکل کر باہر آگیا۔

آج رات وہ ایک مشہور تاجر کے گھر ڈاکا ڈالنے جا رہا تھا۔ اس کے گروہ میں چند دن سے ایک نیا آدمی آیا تھا جسے پہلے تو عبید رکھنے کے لیے تیار نہ تھا لیکن قریبی دوستوں کی ضمانتوں اور سفارشوں پر اس نے اُسے بھی اپنے گروہ میں شامل کر لیا تھا۔ لیکن اصل میں وہ سی۔آئی۔ڈی انسپکٹر تھا اور اس نے پولیس کو پہلے ہی سے آگاہ کر دیا تھا۔ اس تھانے کا ڈی۔ ایس۔پی یاسر کا باپ، عبید کا دشمن فرخ تھا۔ جب عبید اور اس کے ساتھی تاجر کے بنگلے کے باہر پہنچے تو آواز سے وہ اچانک چونک پڑے۔ ڈی۔ ایس۔پی فرخ کہہ رہا تھا "عبید! تمھیں چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے۔ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دو۔ یہی تمھارے لیے بہتر ہے۔ بھاگنے کی کوشش بے کار ہے کیونکہ تم چاروں طرف سے پولیس کے گھیرے میں ہو۔" آواز سُنتے ہی عبید اور اس کے گروہ کے ہوش اُڑ گئے۔ فرخ نے

سب کو گرفتار کر لیا۔ کئی سال مقدمہ چلتا رہا اور عبید جیل میں زندگی کے دن پورے کرتا رہا۔

صبح فیصلہ ہونا تھا۔ تمام رات عبید کا دل بے چینی سے دھڑکتا رہا۔ نیند کوسوں دور تھی۔ آخر صبح فیصلے کا وقت ہوا۔ عبید کو بھی عدالت میں لے جایا گیا۔ گواہوں اور مقتولوں کے عزیزوں کے بیانات سن کر عبید کو پھانسی کی سزا دے دی گئی۔

اگلے ہفتے عبید کو پھانسی دے دی گئی۔ بہت سے لوگ حالات کے بنائے ہوتے بدمعاش کا عبرت ناک انجام دیکھنے آئے۔ اسی طرح ہمارے معاشرے میں نہ جانے کتنے لوگوں کو پھانسی دی جاتی ہے جو پیشہ ور بدمعاش نہیں ہوتے بلکہ زمانے کے بے رحم ہاتھ انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

دعا مانگو ——— عاجزی کے ساتھ

عبادت کرو ——— خلوص دل کے ساتھ

خدمت کرو ——— محنت کے ساتھ

کھاؤ ——— اعتدال کے ساتھ

کام کرو ——— محنت کے ساتھ

گفتگو کرو ——— سنجیدگی کے ساتھ

کاروبار کرو ——— سچائی کے ساتھ

ملازمت کرو ——— دیانت داری کے ساتھ

علم حاصل کرو ——— لگن کے ساتھ

——— صدف غضنفر (لاہور)

اُفق دہلوی (لاہور)

انگور کھٹے ہیں

اک لومڑی تھی بھوکی — حالت بڑی بُری تھی
پھرتی اِدھر اُدھر تھی — بھوکی بہت مگر تھی
کچھ بھی نہ اس نے پایا — تقدیر نے ستایا
اک باغ میں وہ پہنچی — بے چین بھوک سے تھی
انگور اُس نے دیکھے — گچھے تھے پکے پکے
للچایا دل جو اُس کا — ہمت کا جذبہ جاگا
جذبے سے کام لے کر — اُچکی بہت وہ اُوپر
انگور تک نہ پہنچی — کوشش تو اپنی سی کی
تھک ہار کر مڑی وہ — یہ بات کہہ گئی وہ
انگور ہیں یہ کھٹے
میں کیا کروں گی کھا کے

ایک بچہ دوسرے سے: جونہی سورج کی پہلی کرن میرے کمرے میں آتی ہے میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔

"مگر یار آنٹی تو ابھی کہہ رہی تھیں کہ تم سارا دن سوئے رہتے ہو؟" دوسرے بچے نے کہا۔

اس پر پہلا بچہ بولا: "ہاں وہ ٹھیک کہتی ہیں کیونکہ میرے کمرے کی کھڑکی مغرب کی طرف کھلتی ہے۔"

ایک دن اختر کو ضروری کام سے فون کرنے ہمسایے کے گھر جانا پڑا۔ ان کے بچے نے دروازہ کھول کر کہا:

"پلیز آپ اگلے ہفتے آجائیں۔"

"مگر کیوں؟" اختر نے حیرانی سے پوچھا تو بچے نے جواب دیا:

اصل میں ابھی میری امی فون کر رہی ہیں۔

ایک عورت فوٹوگرافر کے پاس گئی اور اسے ایک تصویر دکھا کر کہنے لگی: "میں نے اپنے شوہر سے کہا بھی کہ ٹوپی اتار کر تصویر بنا تا مگر اس نے ٹوپی کے ساتھ ہی تصویر بنوالی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کمالِ فن سے ان کی ٹوپی اتار دیں؟"

فوٹوگرافر نے جواب دیا: جی ہاں! مگر آپ یہ تو بتایئے کہ آپ کے شوہر مانگ سیدھی نکالتے ہیں یا اُلٹی؟

"جب آپ ٹوپی اتار لیں تو خود ہی دیکھ لیجیے گا۔" عورت نے معصومیت سے جواب دیا۔

اُستاد: امریکہ کہاں واقع ہے؟

شاگرد: معاشرتی علوم کے صفحہ نمبر 89 پر۔

مصباح شاہد (لاہور)

ایک پادری افریقہ کے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے۔ وہ ایک جنگل میں گئے۔ وعظ کرتے ہوئے اس نے جنگلیوں

سے کہا کہ: "پچھلے دنوں تم میں چند آدم خور تھے۔ اب کیا صورت حال ہے؟"
جنگلیوں کے سردار نے کہا کہ: "پرسوں رات ہم آخری آدم خور کو بھی بھون کر کھا گئے ہیں۔"

نوید صدیقی (لاہور)

ایک انگریز نے خواجہ حسن نظامی سے کہا: "ہمارے انگریزوں کا رنگ ایک سا ہوتا ہے، لیکن پتا نہیں کیوں سب ہندوستانیوں کا رنگ ایک سا کیوں نہیں ہوتا؟"
خواجہ حسن نظامی نے جواب دیا: "گھوڑوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور سارے گدھوں کا رنگ ایک سا ہوتا ہے۔"

نائلہ بختیار (کوہاٹ)

گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ جب تک جنگ جاری رہی ایک سپاہی اپنے افسر کے ساتھ ساتھ رہا۔ جہاں وہ جاتا سپاہی بھی پیچھے پیچھے جاتا۔ افسر نے اُسے بہت شاباش دی اور کہا: "تم نے مجھے بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں کیوں ڈالی!"
سپاہی بولا: "جناب! میری والدہ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ بیٹا جنگ میں ہمیشہ اپنے افسر کے ساتھ رہنا کیونکہ افسر لوگ بہت کم مارے جاتے ہیں۔"

محمد الطاف حسین شیخ (حیدرآباد)

ایک صاحب گاڑی میں سفر کرتے ہوئے سو گئے اور خراٹے لینے لگے۔ لوگ بڑے تنگ ہوئے۔ ایک صاحب نے ان سے کہا: "میاں اٹھ کر بیٹھو، خراٹے لے رہے ہو۔"
انھوں نے انگڑائی لیتے ہوئے پوچھا: "تمھیں کس نے کہا ہے؟"
ان صاحب نے کہا: "میں نے خود سنے ہیں۔"
"سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔" انھوں نے جواب دیا۔

سہیل احمد جنجوعہ (کھیوڑا)

استاد: برف کو فقرے میں استعمال کرو۔
شاگرد: "پانی ٹھنڈا ہے۔"
استاد: لیکن اس میں تو برف کا ذکر نہیں ہے۔
شاگرد: جناب وہ تو پانی میں پگھل گئی۔

یاسلائی کی تاریخ

شاہد شریف (راولپنڈی)

آج ہم جو دیا سلائی استعمال کرتے ہیں، وہ موجودہ شکل میں سینکڑوں تبدیلیوں کے بعد آئی ہے۔ دیا سلائی کا شمار دنیا کی عجیب وغریب ایجادوں میں ہوتا ہے۔ دنیا میں ایک وقت ایسا بھی تھا جب لوگ آگ کے نام سے بھی ناواقف تھے۔

دیاسلائی بنانے میں انسان نے کئی صدیاں گزار دیں۔ آج کے زمانے میں ہر شخص دیاسلائی کے نام سے واقف ہے مگر اس کی تاریخ ہم میں سے بہت ہی کم لوگ جانتے ہوں گے۔

ابتدائی زمانے میں لوگ آتش فشاں پہاڑوں سے نکلی ہوئی چنگاریوں کے ذریعے سے آگ حاصل کرتے تھے۔ وہ اس آگ سے لکڑیاں سلگا لیا کرتے تھے اور گھر لا کر آگ جلاتے تھے اور اس طرح کی حاصل کی ہوئی آگ کو بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ اور کوشش کی جاتی تھی کہ آگ بجھنے نہ پائے۔ مگر یہ تو ظاہر ہے

کہ آگ کو محفوظ رکھنے کی جتنی بھی کوشش کی جائے، یہ ایک نہ ایک دن بجھ جاتی ہے۔ اس طرح ان لوگوں کو دوبارہ آگ لانے کے لیے سخت مشکل سے گزرنا پڑتا تھا۔

کافی عرصے کے بعد ایک شخص کو مصنوعی طریقے سے آگ جلانے کی ترکیب معلوم ہوئی۔ اسے پہلے سے معلوم تھا کہ ہاتھوں کو زور زور سے ملنے سے ہاتھ گرم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے تجربے سے ثابت کیا کہ خشک لکڑی کے دو ٹکڑوں کو آپس میں رگڑا جائے تو انھیں بھی گرم کیا جا سکتا ہے۔ اس نے خشک لکڑی کا ایک ٹکڑا زمین پر رکھ کر اس کی سطح کو دوسری چھڑی کے نوک دار حصے سے اتنا رگڑا کہ اس میں ایک نالی بن گئی۔ رگڑ کے عمل کے دوران میں اس نالی کے اندر برادہ جمع ہو گیا۔ وہ تیزی اور سختی سے لکڑیوں کو رگڑتا رہا اور جو برادہ نالی میں جمع ہوا تھا، وہ دہکنے لگا۔ اس دہکتے ہوئے برادے پر اس نے خشک گھاس رکھی اور اس کے بعد اتنی پھونکیں ماریں کہ اس میں شعلہ پیدا ہو گیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ انسان نے اپنے لیے خود آگ جلائی۔ پہلے وہ قدرتی طور پر جلنے والی آگ استعمال کرتا تھا۔

یہ دیا سلائی کی ابتدا تھی لیکن یہ طریقہ سخت تکلیف دہ اور محنت طلب تھا۔ بعض اوقات ایک چنگاری پیدا کرنے کے لیے کئی گھنٹے صرف ہو جاتے تھے۔

آگ جلانے کے سلسلے میں دوسرا قدم اس وقت اٹھایا گیا جب یہ بات دریافت ہوئی کہ پتھر، لوہے اور خام دھات کو ایک دوسرے سے ٹکرانے سے آگ کا شرارہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ چقماق (آتشیں پتھر) کا ایک ٹکڑا خام لوہے کے ایک ٹکڑے سے ٹکرایا جاتا اور اس سے بے شمار چنگاریاں نکلتی تھیں۔ ان چنگاریوں کو خشک گھاس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں یا کوئلے کے سفوف میں گرنے دیا جاتا تو فوراً آگ پیدا ہو جاتی۔ لیکن اس میں ایک خامی یہ تھی کہ اس

میں شعلہ پیدا نہیں ہوتا تھا بلکہ آگ صرف دہکنے لگتی تھی۔ پھر اس دہکتی آگ پر خشک
لکڑی کو گندھک میں ڈبو کر رکھا جاتا اور فوراً شعلہ پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ آگ
جلانے کا وہ طریقہ تھا جو رگڑ سے آگ پیدا کرنے کے طریقے کے بعد رواج
میں آیا۔ یہ تقریباً اصلاح یافتہ طریقہ تھا کیوں کہ اس میں وقت کم صرف ہوتا
تھا اور یہ طریقہ آج سے تقریباً ہزار ہا سال پہلے دریافت ہوا تھا۔ اور کافی عرصہ
تک یہی طریقہ استعمال ہوتا رہا۔

اب سے کوئی ساڑھے تین سو سال پہلے آگ جلانے کا ایک اور طریقہ
دریافت ہوا۔ وہ یہ تھا کہ اگر گندھک کے تیزاب کی تھوڑی سی مقدار پوٹاش
اور کھانڈ کے مرکب پر ڈالی جائے تو چمک دار شعلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ آگ جلانے
کا ایک نیا طریقہ دریافت کرنے کے لیے یہ ایک اشارہ تھا۔ اس سے سترہویں
صدی میں ایک سمجھ دار شخص نے اس سے فائدہ اٹھایا اور چند ایسی تیلیاں
جن کے ساتھ گندھک لگی ہوئی تھی، ان کو گندھک کے تیزاب میں ڈبویا اور
اور اس کے بعد پوٹاش اور کھانڈ کے مرکب میں ڈالا۔ اس کے بعد تیلیوں میں
فوراً آگ لگ گئی۔ یہ طریقہ آگ جلانے کے پہلے طریقوں سے بہتر تھا اور
اس کے لیے ضرورت صرف چند کیمیائی حصوں کو ملانے کی تھی۔

اس دیا سلائی کی ایجاد کے بعد لوگوں کی توجہ اس طرف ہوئی کہ وہ کیمیائی

دیاسلائی بنائیں۔ اس وقت جو دیاسلائی استعمال ہوتی تھی، اس کو بنانے کے لیے مندرجہ ذیل چیزیں درکار ہوتی تھیں :-

1۔ گندھک کے تیزاب کی ایک بوتل۔

2۔ ایک بنڈل تیلیوں کا جن کے سروں پر گندھک، پوٹاش اور کھانڈ کا مرکب لگا ہوا ہوتا تھا۔

اس قسم کی دیاسلائی بہت مہنگی ہوتی تھی اور ہر کوئی اسے استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ اور کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ جب ان تیلیوں کو تیزاب میں ڈالا جاتا تھا تو اس میں آگ نہ لگتی اور وہ دہک دہک کر تیزاب کو ادھر ادھر اڑانے لگتی۔ اس سے کپڑے بھی خراب ہوجاتے اور تیزاب بھی ضائع ہوجاتا۔

آخر کار انیسویں صدی میں (جس میں بے شمار عجیب وغریب دریافتیں ہوئیں) دیاسلائی کی ترقی میں ایک اور قدم اٹھایا گیا۔ 1827ء میں برطانیہ کے ایک شخص نے تیلیوں کے سروں پر گندھک کلوریٹ پوٹاش اور سلفائیڈ آف انٹی منی کا مرکب لگا کر انھیں ایک ریگ مال پر رگڑا۔ تیلیاں جلنے لگیں۔ یہی دیاسلائی تھی کہ اصلاح کے ساتھ اس کا استعمال ہم ابھی تک کرتے ہیں۔ یہ دیاسلائی ماضی کی تمام دیاسلائیوں سے بہتر تھی مگر یہ صرف اسی صورت میں جلتی تھی جب اسے زور زور سے رگڑا جاتا تھا اور اس کا شعلہ بھڑکنے لگتا تھا اور ہر طرف آگ گرتی تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد تیلیوں پر انٹی منی کی بجائے فاسفورس لگایا جانے لگا۔

اس سے دیاسلائی کی صنعت میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا۔ اب دیاسلائی معمولی رگڑ سے روشن کی جاسکتی تھی۔ اس کے بعد فاسفورس کی دیاسلائی ایجاد ہوگئی اور پرانے تمام طریقے ختم ہوگئے۔

فاسفورس کی دیاسلائی ایک تو بہت مہنگی ہوتی تھی اور دوسرا اس کا ایک نقصان یہ تھا کہ اگر فرش پر کوئی دیاسلائی رہ جاتی اور اس پر کسی شخص کا قدم آجاتا یا کوئی اور چیز اس پر گر جاتی تو یہ جل اٹھتی۔

ان دیاسلائیوں کے حادثات سے بچنے کے لیے آخر میں سیفٹی دیاسلائی ایجاد ہوئی۔ ان دیاسلائیوں میں فاسفورس نہیں ہوتا بلکہ باقی حصوں کو ایک خاص قسم کی باریک ریت میں ملاکر اس ڈبیہ کے کناروں پر لگا دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب تک دیاسلائی کو خاص ڈبے پر نہ رگڑا جاتے، وہ نہیں جلتی۔ یہ دیاسلائی اتنی بہتر ہے کہ روز بروز فاسفورس کی دیاسلائیاں کم ہوتی گئیں اور اب ان کی مانگ تقریباً ختم ہوچکی ہے۔

آگ جلانے کی طویل تاریخ میں سیفٹی دیاسلائی کی ایجاد آخری قدم ہے اور اس دیاسلائی کو ہم آج بھی کثرت سے استعمال کر رہے ہیں۔

ایک منٹ اور انسان

1. وہ ایک منٹ میں دو سو گز چل سکتا ہے
2. ایک سو پچاس الفاظ بول سکتا ہے۔
3. چالیس الفاظ لکھ سکتا ہے۔
4. ایک منٹ میں اس کا دل تقریباً ۲/۱ سیر خون رگوں میں بھیج سکتا ہے
5. صرف ایک منٹ میں خون جسم کے کونے کونے کا چکر لگاکر واپس دل میں آجاتا ہے
6. ایک صحت مند انسان کا دل ایک منٹ میں 72 بار دھڑکتا ہے۔

ندیم احمد کھوکھر (واہ کینٹ)

چھوٹی سے چھوٹی گھڑی

سوئٹزرلینڈ کی حکومت نے انگلستان کی ملکہ الزبتھ دوم کو ان کی شادی کے موقع پر ایک گھڑی تحفے کے طور پر پیش کی۔ یہ گھڑی پاکستان کے موجودہ پیسے کے آدھے حصے کے برابر ہے۔

راحیلہ یاسمین چغتائی
(لاہور)
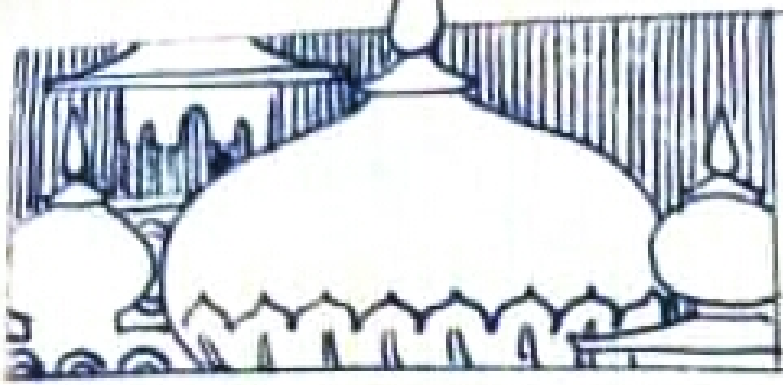
آپ کو معلوم ہوگا!

1۔ اسلام کی راہ میں پہلا خون شہادت حضرت حارث بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ کا بہا۔

2۔ ہجرت مدینہ کے دوران میں جب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام غار میں تھا تو ______ حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہ کھانا پہنچاتی تھیں ______ ایک غلام عامر بن فہیرہ بکریاں چراتے ہوئے وہاں جاتے اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو دودھ دیتے۔ ______ اور ______ حضرت عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ قریش کی دن بھر کی خبریں اُن کو پہنچاتے تھے۔

3۔ مسلمانوں کو نماز کے لیے اکٹھا کرنے کے لیے اذان کی تجویز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پیش کی۔ اذان کے الفاظ انھوں نے خواب میں سنے تھے۔

4۔ فتحِ مکّہ کے موقع پر کُل دو مسلمان شہید اور تیرہ مشرک ہلاک ہوئے۔

5۔ اسلام کا اوّلین دارالتبلیغ حضرت ارقم مخزومی رضی اللہ عنہ کا گھر تھا۔

عنبرین ناصر (ملتان)

دنیا کی سب سے تیز رفتار کار

امریکی فضائیہ نے دنیا کی سب سے تیز رفتار موٹر کار بنائی ہے۔ اس کار میں ہوائی جہازوں میں استعمال ہونے والا جیٹ انجن لگایا گیا ہے۔ اسے زمین سے اٹھ جانے سے روکنے کے لیے اس کے اگلے دو پہیوں پر وزنی ڈھکنے لگا دیے گئے ہیں اور پچھلی جانب پتوار لگا دی گئی ہے تاکہ یہ سیدھی دوڑ سکے۔ جب تجربے کے طور پر اسے چلایا گیا تو اس کی رفتار ۵۱۶ سے لے کر ۵۲۶ میل فی گھنٹا تھی۔

حساس ترازو

سائنس دانوں نے ایک نہایت حساس ترازو ایجاد کیا ہے جس سے دنیا کی ہلکی سے ہلکی چیز تولی جاسکتی ہے مثلاً ایک باریک سے نقطے کا وزن کرنا ہو تو پہلے اس پر ایک کاغذ کا وزن کیا جاتا ہے۔ پھر اس کاغذ کو اتار کر اس پر ایک باریک پنسل سے نقطہ لگا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب کاغذ کو دوبارہ تولا جائے تو یہ کانٹا بتا دیتا ہے کہ پنسل کے نقطے کا وزن دس گاما ہے۔ جب کہ ایک گاما ایک گرام کا دس لاکھواں حصہ ہوتا ہے۔

صراف طوطا

بولنے والے طوطے آپ نے بھی دیکھے ہوں گے جو انسانی آوازوں کی بہترین نقل اتار سکتے ہیں۔ لیکن دہلی (ہندوستان) میں ایک شخص کے پاس بہت ہی عجیب وغریب طوطا ہے۔ یہ طوطا کھرے اور کھوٹے سکے بتا دیتا ہے۔ اس کے سامنے اگر کھرے اور کھوٹے سکے ملا جلا کر ڈال دیئے جائیں تو وہ اپنی چونچ سے کھوٹے سکے دوسری پیالی میں ڈال دیتا ہے۔ وہ اصلی نقلی سونا بھی شناخت کر لیتا ہے۔

منقش ہاتھ پاؤں

مراکش میں بہت سے قبائل ایسے ہیں جہاں عورتیں اپنے ہاتھوں اور پیروں پر رنگین نقش ونگار بناتی ہیں۔ یہ عورتیں اس طرح نقش ونگار بناتی ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انھوں نے ہاتھوں میں دستانے اور پیروں میں موزے پہن رکھے ہوں۔

منیر احمد (لاڑ و)

اپنا امتحان لیجیے

آصف لطیف (نارنگ)

اس عنوان سے آپ کو دس سوال دیے جا رہے ہیں۔ ہر سوال کے نمبر دس ہیں۔ اگر آپ نے 80 نمبر حاصل کیے تو آپ ذہین ہیں۔ اگر 50 تو آپ کی قابلیت درمیانی ہے اور اگر اس سے بھی کم تو آپ کو اپنا مطالعہ تیز کر دینا چاہیے۔

1. ہٹلر کا تعلق کس ملک سے تھا؟
2. پاکستان بننے کے بعد کرکٹ کے سب سے پہلے کپتان کون تھے؟
3. ایکسرے کس نے اور کب ایجاد کیا؟
4. تربیلا ڈیم کی اونچائی کیا ہے؟
5. یونان میں تو بہت سے مشہور فلسفی ہوتے ہیں چین کے کسی ایک مشہور فلسفی کا نام بتائیے؟
6. درۂ خیبر کی لمبائی کتنی ہے؟
7. درۂ خیبر سے گزر کر آپ کس ملک کو جا سکتے ہیں؟
8. براعظم افریقہ میں آزاد ملکوں کی تعداد کیا ہے؟
9. شاہ فیصل کو کس نے شہید کیا تھا؟
10. خلائی سفر کے لیے کتنے کلومیٹر فی گھنٹہ رفتار کی ضرورت ہوتی ہے؟

جوابات: (1) جرمنی (2) عبدالحفیظ کاردار (3) جرمنی کے رونٹگن نے 1895ء میں (4) 148 میٹر (5) کنفیوشس (6) تقریباً 53 کلومیٹر (7) افغانستان (8) 25 کے قریب (9) ان کے بھتیجے نے 25 مارچ 1975ء کو (10) 26,000 کلومیٹر فی گھنٹہ۔

بچوں کے لیے
سائنسی اور معلوماتی کتابیں
راکٹ ، مِزائل اور مصنوعی سیّارے
پُرانے زمانے کی آتش بازی ہوائی سے لے کر موجودہ زمانے کے ٹینک توڑ اور طیارہ شکن
راکٹوں ، دور مار مِزائلوں ، زمین کے گرد گردش کرنے والے مصنوعی سیّاروں اور چاند پر
اترنے والے ہوائی جہازوں کی دل چسپ کہانی —— جگہ جگہ تصویریں۔
ایجادوں کی کہانیاں
اُن تمام بڑی بڑی ایجادوں کی دل چسپ کہانیاں جن سے
اِنسان کو بہت فائدہ پہنچا۔
موجدوں کی کہانیاں
اُن مُوجدوں کی زندگی کے حالات جنھوں نے اپنی مفید
ایجادوں سے دُنیا کی کایا پلٹ دی۔
کیا ، کیوں ، کیسے
عام سائنسی اور معلوماتی سوال اور ان کے جواب ، آسان اور
دل چسپ زبان میں۔
فیروز سنز
لاہور - راولپنڈی - کراچی

آپ بھی پُوچھیے!

سوال : کیا حضرت لقمان کی وہ کہانی جو کچھ پہلے آپ نے چھاپی تھی ، واقعی سچی ہے ؟ ——— جاوید اقبال (داؤد پور)

جواب : حضرت لقمان کا ذکر تو قرآن میں موجود ہے ۔ آپ کو یاد ہوگا کہ قرآن کی ایک سورت ان کے نام پر ہے

سوال : میری ہر تحریر آپ ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتے ہیں ؟ ——— منیر احمد منیر (لالہ موسیٰ)

جواب : ہم چھپنے کے قابل ایک سطر کو بھی ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے ۔ ہاں البتہ جو مضمون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے ۔

سوال : میرا مضمون شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ ! ——— محمد اشرف ناز (اجنیانوالہ)

جواب : عزیزم ! اس تکلف کی ضرورت نہیں ۔ ہم ہر قابلِ اشاعت مضمون چھاپ کر خوشی محسوس کرتے ہیں اور مضمون نگاروں کے شکر گزار ہوتے ہیں ۔

سوال : آپ کو تصویر کس طرح بھیجی جائے ؟ ——— محمد حبیب القادر (ملتان)

جواب : ڈاک کے لفافے میں ڈال کر بھیج دیجیے ۔

سوال : اس بار رسالے کا بہت انتظار کیا لیکن پھر ——— (فرش بتول ، فیصل (فیصل آباد)

جواب : آپ لوگوں نے تو صرف انتظار کیا ۔ ہم نے نہ جانے کیا کیا کیا۔ بس جی ! مختصر بات یہ ہے کہ ہمیں اس کے لیے کاغذ نہیں مل رہا تھا ۔ دعا کیجیے کہ آئندہ کبھی ایسی صورت نہ ہو ۔

سوال : کیا آپ ہماری خواہش پر جلد بچوں کے لیے کوئی قسط وار ناول شروع کر رہے ہیں ؟

جواب : جی ہاں ! یہ بات آپ نے اس بار اداریے میں بھی پڑھ لی ہوگی ۔

اُلٹی مصیبت ———— **پرنس محمد عاصم۔ لاہور**

آج سے تقریباً ایک سال پہلے کا واقعہ ہے جب ہم گیارہویں کلاس میں پڑھتے تھے۔ ہماری کلاس میں ہمارے ساتھ ایک لڑکا پڑھتا تھا۔ نام تو اس کا عابد تھا مگر کلاس کے سارے لڑکے اُسے مچھر کے نام سے پکارتے تھے۔ وہ تھا بھی مچھر کی طرح دُبلا پتلا، لمبا قد اور اس کے ساتھ کمزور دل۔ اگر جان تھی تو وہ اس کی زبان میں تھی جو خوب چلتی تھی۔ ہماری اس سے خوب بنتی تھی اور ہم اُسے ستانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

ایک روز جب چھٹی ہوئی تو ہم گھر جانے کے لیے کلاس سے باہر آئے۔ ہمارے ساتھ مجاہد اور مچھر بھی تھا۔ مجاہد نے اپنی موٹر سائیکل نکالی اور اس پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کرنے لگا۔ پھر اسے بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ اور پھر کہنے لگا:

"اچھا! اس طرح اسٹارٹ ہوتا ہے موٹر سائیکل!"

میں نے مجاہد کو آنکھ ماری تو وہ مسکرایا اور بولا "ہاں، اس طرح موٹر سائیکل اسٹارٹ ہوتا ہے۔ مگر یہ تم سے کیا چلے گا۔"

"واہ! کیسے نہیں چلے گا۔ آخر اس میں کون سے منتر پڑھنے ہوتے ہیں۔ میں چلاتا ہوں۔"

ٹھہرو!" میں نے انھیں ٹوک دیا۔ "اِدھر ٹریفک ہے۔ ہو سکتا ہے اِدھر کوئی حادثہ ہو جائے۔ اِدھر پچھلی طرف ایک ویران سی گراؤنڈ ہے۔ وہاں چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" سب مان گئے۔ وہاں پہنچ کر مجاہد نے مچھر کو اسٹارٹ کرنے کے متعلق ہدایات دیں اور اسے موٹر سائیکل پر بٹھا دیا۔ مچھر نے ہدایت کے مطابق سوئچ آن کیا، کک لگائی اور کلچ دبایا۔ موٹر سائیکل ایک جھٹکے سے چلا۔ جونہی موٹر سائیکل چلا، ہم نے مسکرا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ چلو! آج اس نے موٹر سائیکل چلانا شروع کر دیا۔ کل کلاس میں اس کا مذاق اُڑائیں گے۔ مجاہد نے مسکرا کر کہا۔ اِدھر مچھر صاحب دور موٹر سائیکل پر سوار ایسے نظر آ رہے تھے جیسے کوئی مریل اَڑیل گھوڑے پر بیٹھا ہو اور ایسے لگ رہا تھا کہ بس گرا کہ اب گرا۔ جب وہ گراؤنڈ کا چکر لگا کر ہمارے نزدیک آیا تو ٹھہرا نہیں البتہ کچھ بولا جو ہمیں سنائی نہیں دیا۔ ہم سمجھے کہ شاید وہ ابھی سواری کا لطف اٹھانا چاہتا ہے۔ دوسرے چکر پر دُور سے ہی نعرہ لگاتا آیا۔ "ارے روکنا! ارے روکنا!" لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ پھر آگے نکل گیا۔

اب ہم پر یہ راز کھلا کہ مچھر نے موٹر سائیکل چلانا تو سیکھ لیا لیکن اسے روکنے کا طریقہ بالکل نہ آتا تھا۔

اتنے میں پھر پھٹ پھٹ کی آواز سنائی دی اور سامنے ہی مچھر التجائیہ میں "ارے روکنا بھائی! روکنا" کہتا ہوا تیزی سے دُور نکل گیا۔ ہمارے پیٹوں میں بل پڑ گئے۔ میں نے مجاہد سے کہا "اب اسے ٹھہرانے کی کوشش کرو ورنہ سارا پٹرول ضائع ہو جائے گا۔"

کہنے لگا۔ فکر نہ کرو میں پوری ٹنکی بھروا کر لایا ہوں۔ کم از کم پچاس چکر لگائے جا سکتے ہیں۔

اسی اثنا میں مچھر صاحب دو چار چکر اور لگا چکے تھے۔ ان کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ کھنچا ہوا، زرد، پریشان چہرہ جس پر پسینے کے قطرے نمایاں تھے۔ آنکھیں باہر کو نکلی ہوئیں اور دانت معمول سے کچھ زیادہ بڑے اور باہر نکلے نظر آ رہے تھے۔ بڑی تکلیف سے آرام دہ گدی پر ایسے بیٹھا تھا جیسے اُسے کوئی کیل چبھ رہی ہو۔ موٹر سائیکل تھا کہ بھاگا چلا جا رہا تھا، ہمیں ہنسی کے ساتھ ساتھ ترس بھی آ رہا تھا۔ مجاہد نے ایک دفعہ بھاگ کر اس پر موٹر سائیکل قابو میں کرنے کی کوشش کی مگر رفتار اتنی تیز تھی کہ مچھر صاحب کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔ مچھر کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو سنبھالے بیٹھا تھا۔ اب ہم ہر چکر پر موٹر سائیکل قابو میں کرنے کی کوشش کرتے مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ آخر تنگ آ کر میں نے کہا: "اسے چکر لگانے دو۔ آخر کبھی تو پٹرول ختم ہو گا اور نواب مچھر صاحب کا شوق بھی پورا ہو جائے گا اور پریکٹس بھی خوب ہو جائے گی۔"

مچھر چکر پر چکر لگا تا رہا۔ اچانک گراؤنڈ میں ایک کمہار گدھوں پر مٹی لادے داخل ہوا۔ ہماری موٹر سائیکل روکنے کی کوشش ناکام ہو چکی تھی اور موٹر سائیکل کے پندرہ بیس چکر لگ چکے تھے۔ مچھر اب قریب آنے لگا۔ کچھ گدھے جن پر مٹی کے بورے لدے ہوئے تھے، اس کی مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ مچھر نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، موٹر سائیکل کا رُخ گدھوں کی طرف کر دیا۔ اس سے پہلے کہ ہم حیرت سے بے ہوش ہوتے، موٹر سائیکل ایک گدھے سے ٹکرایا۔ گدھے بورے سمیت دوسرے گدھے پر اور دوسرا گدھا اپنے بورے کے ساتھ تیسرے گدھے پر گرا اور ہمارے ہوش اُڑ گئے۔ یک بیک زمین پر ایک عجیب سا ڈھیر بن گیا تھا جس میں مٹی کے نیچے گدھوں کی ٹانگیں عجیب بے بسی کی حالت میں ہل رہی تھیں۔ موٹر سائیکل کے نیچے دبے

ہوئے مچھر صاحب آدھے موٹر سائیکل اور آدھے مٹی کے نیچے نیم دراز تھے اور نیم بے ہوش تھے اور گدھوں والا نہایت پریشانی کے عالم میں غصّے سے ہمیں گھورے جا رہا تھا۔ ہم نے تیزی سے بھاگ کر پہلے مچھر کو باہر نکالا اور گھاس پر لٹا دیا۔ پھر موٹر سائیکل سنبھالا۔ اس کا کچھ نہ بگڑا تھا۔ صرف صفائی کی ضرورت تھی۔ ایک گدھا معمولی سا زخمی ہوا تھا۔

خیر بڑی مشکل سے ہم نے گدھے والے کے مٹی کے بورے بھرے اور اس کی منت سماجت کر کے اور دس روپے دے کر اس سے جان چھڑائی۔ مچھر کو سہارا دے کر ہمیں اس کے گھر پہنچانا پڑا۔ وہاں اس کے گھر والوں سے جتنی جھڑکیاں وغیرہ ہمیں سہنی پڑیں، اسے راز ہی رہنے دیں۔ بس ہم یہ سوچتے ہوئے گھر واپس آئے کہ کاش موٹر سائیکل چلانے سے پہلے اسے روکنے کا طریقہ مچھر نے معلوم کر لیا ہوتا تو یہ مصیبت نہ اٹھانی پڑتی۔

بس اس روز کے بعد مچھر کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی نصیحت ہو گئی، اور ہم نے بھی شرارتوں سے توبہ کر لی۔

خزانے کا نقشہ

عامر عبدالرزاق

کچھ ہی عرصہ ہوا مجھے اور میرے دوستوں کو خزانے کی تلاش کا چسکا لگ گیا۔ ہم نے سوچا کہ اس مہم کا آغاز کیسے کیا جائے مگر کسی کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ ایک دن ابا جان کے ساتھ بازار سے گزرا تو مجھے ایک گوشے میں گھسا پٹا کاغذ پڑا نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ یہ کسی بہت پرانے خزانے کا نقشہ تو نہیں، اس لیے میں نے نظر بچا کر کاغذ اٹھا لیا۔ دیکھا تو وہاں واقعی ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ نقشے میں ایک جگہ بہت ہی چھوٹے حرفوں میں عابد لکھا نظر آیا مگر ہم نے اسے نظر انداز کر دیا۔ شام ہونے کو تھی اس لیے پروگرام دوسرے دن پر ملتوی کر دیا گیا۔

اگلے دن ہم تینوں مقررہ جگہ پر پہنچ گئے۔ نقشے پر ہم نے ایک سرخ نشان دیکھا۔ ہم تینوں نے نقشہ سامنے رکھا اور اس کے مطابق سرخ نشان کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ کئی جگہوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک کھیت کے کنارے پہنچ گئے۔ اب تک شام ہو چکی تھی۔ ہم تینوں کو بہت ڈر لگا۔ پندرہ منٹ کے بعد ہی ہمیں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم تینوں وہاں سے دُم دبا کر بھاگے اور گھر پہنچ کر ہی دم لیا۔ دوسرے دن سکول کے جماعت کے تمام لڑکوں کو سارا حال سنایا کہ ہم تو ایک کھیت تک ہی پہنچے۔ سننے والوں میں عابد بھی تھا۔ اس نے مجھ سے نقشہ مانگا اور پھر دیکھ کر خوب ہنسا اور کہنے لگا کہ یہ تو اس کے ہاتھ کا بنا ہوا نقشہ ہے۔ اس کے اپنے کھیت تک جانے کے راستے کا نقشہ۔

ایک رات کی بات

عدنان گل (راولپنڈی)

گرمیوں کی رات تھی۔ مچھروں کی بھن بھن نیند کو قریب نہیں آنے دیتی تھی۔ میں اپنے کمرے میں، پسینے میں شرابور لیٹا ہوا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے طرح طرح کے خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔ مچھروں کے حملے سے بچنے کے لیے چادر لپیٹ کر سونے کی بہت کوشش کی مگر نیند کا کوسوں تک نشان نہ تھا۔

یوں ہی لیٹے لیٹے رات کے بارہ بج گئے۔ اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی پاؤں میں گھنگرو باندھے چہل قدمی کر رہا ہو۔ پہلے تو میں نے اُسے اپنا

کوئی وہم سمجھا لیکن جب دوبارہ گھنگروؤں کی آواز سنائی دی تو ڈر لگنے لگا۔ بچپن میں سنی ہوئی ڈراؤنی کہانیاں حقیقت معلوم ہونے لگیں۔ دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ خیال ہی خیال میں ایک بھیانک جن کا سایہ نظر آنے لگا۔

گھنگرو متواتر بج رہے تھے۔ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ ایک تو گرمی نے بے حال کر رکھا تھا۔ دوسرے جن بھوت کا خوف۔ حالت بگڑنے لگی۔ کچھ نہ سوجھتا تھا کہ کیا کروں۔ گھبراہٹ میں سب دعائیں بھول گئی تھیں۔ بس اللہ کا نام زبان پر آیا تو تھوڑی سی ڈھارس بندھی۔ ہمت کر کے اٹھا کہ بلب جلاؤں لیکن سوئچ دبایا تو بلب نہ جلا۔ بجلی چلی گئی تھی۔ اُدھر وہ خوف ناک آواز آئے جا رہی تھی۔ خوف کی وجہ سے میرا رُواں رُواں کانپ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے آیت الکرسی یاد آئی۔ وہی پڑھنے لگا۔

آخر خدا خدا کر کے بجلی آئی اور کمرہ روشن ہو گیا۔ جب کچھ حوصلہ ہُوا تو میں نے دوڑ کر الماری سے ہاکی نکالی اور ہمت کر کے کمرے سے باہر نکلا۔ کان لگا کر سُنا تو بجنے کی آواز برابر کے کمرے سے آ رہی تھی۔ خوش قسمتی سے اس کمرے کا سوئچ باہر برآمدے میں لگا ہوا تھا۔ میں نے سوئچ آن کیا اور دونوں ہاتھوں میں ہاکی تھام کر ایک دم کمرے میں گھس گیا۔

ہت تیرے کی! کمرے میں ہمارا پالتو مینڈھا بندھا ہوا تھا اور وہ آواز اسی کے پاؤں میں بندھے ہوئے گھنگروؤں کی تھی جسے سُن کر مجھے جن بھوت کا گمان ہوا تھا۔

زہر!

صبا امین اکورٹ

ارشد اور محمود دو دوست تھے۔ علم کے زیور سے آراستہ۔ دونوں نے حساب میں ایم۔اے کیا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک ساتھ نوکری کی تلاش میں نکلنے والے تھے۔

"یار ارشد! کم از کم سترہ گریڈ کی نوکری تو مل ہی جائے گی۔"

"ہاں، ہاں! کیوں نہیں۔ ارشد بولا۔

"تو چلو چلیں۔ آج گھر بھی جانا ہے۔ ایک ماہ ہوگیا ہوسٹل میں۔"

"بالکل! مجھے بھی جانا ہے۔" ارشد مسکراتے ہوتے بولا۔ دونوں دوست ہوسٹل سے نکل گئے۔

ارشد اور محمود ہوسٹل کے ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ ان دونوں کے گھر بھی کچی آبادی میں تھے۔ دونوں غریب خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

ارشد اپنی پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ دو بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ تین ابھی بیاہنی تھیں۔ ماں باپ کو بہت فکر تھی اور یہی فکر ان کو جلدی بوڑھا کرنے پر تلی [illegible]ی۔ بڑی مشکل سے گزارا ہوتا تھا۔

دوسری طرف محمود اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ان کا تو گزارا آرام سے ہوجاتا۔ ماں باپ کو اگر کسی چیز کی ضرورت بھی ہوتی تو بیٹے سے نہ کہتے کیونکہ وہ اسے کسی حالت میں پریشان نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ماں تو اُسے دیکھ کر جیتی۔ لگتا تھا کہ محمود کے والدین اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔

"وہ دیکھو سامنے بینک کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہے۔ چلو، دیکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کہیں کوئی نوکری مل جائے۔" محمود بولا۔

"مشکل ہی لگتا ہے۔ ایک تو ہمارے ملک میں رشوت یا سفارش کے بغیر نوکری ملنا مشکل ہے۔" ارشد جھنجلاتے ہوتے بولا۔

"لیکن کوشش میں کوئی حرج نہیں۔" محمود بولا۔

ارشد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں کے قدم عمارت کی طرف اُٹھنے لگے۔

"ہمیں افسوس ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔" منیجر کہہ رہا تھا۔

محمود گھر پہنچا تو ماں کہہ رہی تھی "اب ہمیں اپنے بیٹے کی شادی کی فکر کرنی چاہیے۔ ماشاءاللہ پچیس برس کا ہو گیا ہے۔"

"ماں اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی نوکری تو ملنے دو۔" محمود مسکراتے ہوئے بولا۔

"ارے تو کب آیا میرے چاند؟" ماں نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"ماں! ابھی آیا ہوں۔" محمود بولا۔ "ماں بہت تھک گیا ہوں۔ کھانا لا دو۔"

"اچھا بیٹے! تو منہ ہاتھ دھو لے۔"

کھانا کھاتے ہوتے ماں کہہ رہی تھی۔ "ارشد کی بہن کو اپنے گھر میں بہو بنا کر لاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے ماں۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

"تو پھر چاند کی چودھویں تاریخ کو منگنی کرنے جاؤں گی۔ مجھے اُمید ہے ارشد کی ماں ہاں کر دے گی۔" محمود کی ماں کے چہرے پر جیسے شفق پھوٹ رہی تھی۔

ارشد تھکا ہارا گھر آیا تو باپ کی کھوں کھوں کی آوازیں کان میں پڑیں۔ بہنیں گھبرا کر کبھی باپ کی طرف دیکھتیں، کبھی باہر۔ جیسے ہی اُن کی نظر ارشد پر پڑی، جلدی سے بولیں۔ "بھیا ارشد! ابا کی طبیعت بہت خراب ہے۔" اندر گیا تو دیکھا کہ اس کی ماں اس کے باپ کے سرہانے بیٹھی

سر دباری ہے۔
"بیٹے! تو آگیا ـــــــــ جلدی سے ابا کی دوا لے آ" ماں بولی۔
"لیکن ماں! پیسے؟ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔" ارشد بولا۔
بہنیں ایک طرف کھڑی رو رہی تھیں۔ ماں نے سر جھکا لیا۔ ارشد تیزی سے کمرے سے باہر نکلا اور اپنے کمرے میں گیا۔ اپنے جیتے ہوئے سونے کے تمغے اٹھائے۔ اُن پر ایک نظر ڈالی۔ اب صرف یہی چیز رہ گئی ہے بیچنے کو۔ اور یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔
ارشد: "یہ خرید و گے؟ خالص سونے کا ہے۔"
دکان دار: "بھیا۔ یہ چیزیں تو عام ہیں۔ سونے وونے کی نہیں ہیں۔ یہ تو پیتل اور لوہے کو ملا کر بنتی ہیں۔ اگر بیچنی ہی ہیں تو بیس روپے تک خرید لونگا۔"
ارشد کو یوں محسوس ہوا کہ اس کے قدموں سے زمین نکلی جا رہی ہے۔ بوجھل قدموں سے گھر پہنچا تو ماں اور بہنوں کے بین کرنے کی آوازیں آئیں۔ ابا مرگئے ـ ـ ـ ـ ـ ـ نہیں نہیں ـ ـ ـ ـ ـ ـ یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنے زور سے چیخا کہ یک لخت پورے گھر میں خاموشی چھا گئی۔ اور پھر ابا کا چالیسواں ہو گیا بہنیں اور ماں اب بھی روئیں لیکن ان کی آواز سُننے والا کوئی نہ تھا۔ ارشد اب ارشد نہ رہا تھا۔ وہ تو زہر پی رہا تھا۔ ہیروئن جیسا زہر۔ اس کی ڈگریاں سگریٹ کے ساتھ آہستہ آہستہ جل رہی تھیں۔
دوسری طرف محمود نوکری کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا اور ایک جگہ اُسے ایک کالج میں کلرک کے طور پر پانچ سو روپے کی نوکری مل گئی۔ وہ ڈگریاں جن پر محمود فخر کرتا تھا، اس کے کسی کام نہ آئیں۔ وہ شیلڈ اور تمغے سب بے کار ہو گئے۔
واپسی پر وہ سوچتا ہوا آ رہا تھا کہ ماں باپ کیا کہیں گے کہ اس کے پڑھے لکھے بیٹے نے کیسی نوکری قبول کر لی۔ یہی سوچتے ہوئے اس نے سڑک پار کرنا چاہی لیکن ـ ـ ـ ـ ـ ـ ایک ٹرک اسے گھسیٹتا ہوا نکل گیا۔ لوگوں نے

ٹرک ڈرائیور کو باہر نکال کر اُسے پیٹنا شروع کر دیا۔ طلبا ء نے ٹرک کو آگ لگا دی لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ محمود کے جسم کے ٹکڑے اس کے بھتیجے کے ساتھ سڑک پر بکھرے پڑے تھے۔ اس کی موٹی موٹی کتابیں اور ڈگریاں اس کے ہاتھوں سے آزاد ہو چکی تھیں۔

"بہت ارمان تھا اُسے اِن ڈگریوں پر جو اس کے کچھ کام نہ آسکیں۔"

اور دوسری طرف دیوار سے ٹیک لگائے ایک سوکھے بنجر شخص نے ایک قہقہہ لگایا اور سگریٹ کا ایک زوردار کش لیا۔ یہ ایک دوست کا دوسرے دوست کے لیے نذرانہ تھا۔

بے وقوف موجو!

ایک گاؤں میں ایک آدمی رہتا تھا۔ نام اس کا تھا موجو۔ وہ بہت بے وقوف تھا۔ ایک دن وہ اپنی ساس کے گھر گیا تو ساس نے اس کو کھچڑی کھلائی جو موجو کو بہت پسند آئی۔ چونکہ کھچڑی اس نے پہلی دفعہ کھائی تھی اس لیے موجو کو اس کا نام نہیں آتا تھا۔ اس نے اپنی ساس سے اس کا نام پوچھا، اس کی ساس کو پتا تھا کہ اس کا داماد بہت بے وقوف ہے، اس لیے اس نے کہا کہ اس کا نام کھچڑی ہے۔ موجو نے دل میں سوچا کہ میں گھر جا کر اپنی بیوی سے کہوں گا کہ مجھے کھچڑی بنا کر دے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں سارا راستہ اِسے یاد کرتا جاؤں۔

پھر وہ ساس کو خدا حافظ کہہ کر گھر کو روانہ ہوا۔ وہ راستے میں کھچڑی کھچڑی کہتا رہا۔ اچانک ہی وہ کھاچڑی کھاچڑی کہنے لگا۔ آگے ایک کسان اپنی فصل سمیٹ رہا تھا۔ جب اس نے سُنا کہ موجو کھاچڑی کھاچڑی کر رہا تھا تو وہ سمجھا کہ موجو چڑیوں سے کہہ رہا ہے کہ اس کی فصل کھا لو۔ اب اس کسان کو بہت غصہ آیا اور اس نے موجو کو بہت مارا اور کہا کہ کہو "اڑ چڑی، اڑ چڑی"

موجو تو تھا ہی بے وقوف۔ اس نے یہی
کہنا شروع کر دیا۔
آگے گیا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک
شکاری چڑیوں کو جال میں پھنسانے کی
کوشش کر رہا ہے۔ جب اس نے
سنا کہ موجو "اُڑ چڑی اُڑ چڑی" کہہ رہا ہے
تو وہ سمجھا کہ وہ چڑیوں سے کہہ رہا ہے
کہ چڑیو اُڑ جاؤ۔ اس نے موجو کو
ڈانٹا اور کہا کہ کہو "آتے جاؤ، پھنستے جاؤ"۔ موجو نے پھر یہی کہنا شروع کر
دیا۔ آگے اسے دو چور ملے۔ جب انھوں نے موجو کو "آتے جاؤ پھنستے جاؤ"
کہتے سنا تو ان کو بہت طیش آیا اور انھوں نے موجو سے کہا کہ تم یہ کہو "لاتے
جاؤ، رکھتے جاؤ"۔ موجو نے یہی کہنا شروع کر دیا۔ آگے ایک آدمی کا جنازہ جا
رہا تھا۔ انھوں نے جو موجو کو یہ کہتے سنا تو بہت ناراض ہوئے اور بعد میں
موجو سے کہا کہ کہو "خدا یہ دن کسی کو نہ دکھائے"۔
موجو نے یہی کہنا شروع کر دیا۔ آگے کسی کی شادی ہو رہی تھی۔ انھوں
نے جب موجو کو "خدا یہ دن کسی کو نہ دکھائے" کہتے سنا تو اُسے بہت مارا
اور کہا کہ کہو "خدا یہ دن سب کو دکھائے"۔

آگے گیا تو وہاں شوہر اور بیوی کے درمیان زبردست لڑائی ہو رہی
تھی۔ اُنھوں نے جب موجو کو یہ کہتے سنا تو انھوں نے اس کو بہت مارا۔ اب
موجو بے چارا اپنی چوٹوں پر ہاتھ رکھے گھر کے اندر داخل ہوا تو اسے کھچڑی
کا لفظ سرے سے یاد ہی نہیں تھا، مگر پھر بھی اس نے اپنی ماں سے کہا کہ
مجھے وہ کھلاؤ جو تمھاری ماں نے کھلائی تھی۔ بیوی نے پوچھا: آخر تم کیا
کھا کر آئے ہو؟ موجو نے کہا، تمھاری ماں کو پتا ہے۔ بیوی نے دوبارہ
وہی سوال کیا تو موجو ان لوگوں کو کوسنے لگا جنھوں نے اُسے کھچڑی کا لفظ

بُلا دیا تھا۔ ان لوگوں کا غصّہ اس نے اپنی بیوی پر نکال دیا اور اتنا ڈانٹا کہ وہ رونے لگی۔ رونے کی آواز سن کر پڑوسن آئی اور ماجرا پوچھا لیکن دونوں خاموش رہے۔ پھر پڑوسن نے موجو سے کہا کہ دیکھو، تم نے اپنی بیوی کو رُلا رُلا کر اس کی کھچڑی بنا دی ہے۔ کھچڑی کا نام سنتے ہی موجو اچھلا اور کہا کہ یہی تو میں وہاں سے کھا کر آیا تھا۔

اس کے بعد اس نے اپنی بیوی سے معافی مانگی اور اس کی بیوی نے اسے کھچڑی بنا کر دے دی۔

بُرائی کے بدلے

کاشف عزیز۔ کراچی

اختر اور ارشد دونوں ایک ہی محلّے میں رہا کرتے تھے اور ہم جماعت تھے۔ ارشد پڑھنے میں بہت تیز تھا اور اوّل آتا تھا۔ اس کے برعکس اختر پڑھائی میں دلچسپی نہ لیتا تھا۔ دونوں بظاہر دوست تھے لیکن اختر دل ہی دل میں ارشد سے حسد کیا کرتا تھا۔ ارشد دل کا بہت اچھا تھا۔ اُسے خبر نہ تھی کہ اختر اس سے جلتا ہے۔ خبر ہوتی بھی کیسے جو لوگ دل کے اچھے ہوتے ہیں، وہ دوسروں کو بھی اچھا سمجھتے ہیں۔

ایک دن اختر، ارشد کے گھر آیا اور کہا "یار! تالاب پر چلتے ہیں۔ آج موسم بہت خوش گوار ہے۔"

ارشد اختر کے ساتھ تالاب پر چلنے کے لیے تیار ہوگیا۔ پہلے تو وہ دونوں کھیلتے رہے، پھر اختر نے ارشد کو تالاب میں دھکا دے دیا اور پھر خود بھاگ گیا۔

ارشد بے چارا ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ کچھ لوگ وہاں موجود تھے۔ انھوں نے تیر کر ارشد کو بچا لیا۔ اب ارشد کو پتا چلا کہ اختر دراصل اس سے نفرت کرتا ہے۔ خیر ارشد صبر کرکے چُپ ہو رہا۔

وقت گزرتا گیا۔ دونوں بڑے ہو گئے۔ ارشد نے سوچا۔ میں کسی وقت بعد میں
بدلہ لوں گا۔
ایک دن ارشد گھر جا رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا اختر کو پانی
میں دھکا دے رہا تھا۔ وہ لڑکا دھکا
دے کر بھاگ گیا۔ ارشد نے سوچا کہ
اسے پانی سے نہ نکالوں۔ دوسری طرف
اختر ڈوب رہا تھا۔ ارشد نے ایک
لمحے کے لیے سوچا، پھر فیصلہ کر لیا
کہ وہ اختر کی مدد کرے گا۔ وہ گیا اور
لوگوں کو جمع کر لیا۔ لوگوں نے اختر کو
بچا لیا۔ اختر کا سر ندامت سے جھک
گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے تو ارشد سے برائی کی اور اس نے اس کا بدلہ
بھلائی سے دیا۔
اختر نے ارشد سے معافی مانگی اور پھر دونوں نے عہد کیا کہ مل جل کر
رہیں گے اور کسی کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔ بُرائی کے بدلے نیکی کرنا کتنی
بڑی بات ہے۔

محمد شہاب حسن (اسلام آباد)

احساس!

اسلم چودہ سال کا ایک لڑکا تھا۔ وہ اپنے والدین کا اِکلوتا بیٹا تھا۔
اسی لیے والدین اس کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ اُسے آوارہ گردی
کرنے اور بازاروں میں بے مقصد گھومنے پھرنے سے روکتے تھے۔ لیکن
اسلم یہ چاہتا تھا کہ اسے بھی دوسرے لڑکوں کی طرح پھرنے کی اجازت ہو۔

اس بات پر وہ اکثر اپنے والدین سے ناراض ہو جاتا تھا۔ اس کا دل گھر سے باہر بازاروں میں گھومنے پھرنے کو چاہتا تھا۔ اسلم کو تصویریں بنانے کا بہت شوق تھا۔ وہ بہت اچھی تصویریں بناتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے انکل کی تصویر بھی بنائی تھی جو کہ ہو بہو ان سے ملتی تھی۔

ایک دن اسلم رنگ اور برش لینے کے لیے بازار گیا۔ دونوں چیزیں لینے کے بعد جب وہ واپس آرہا تھا تو سڑک کے ایک طرف اسے ایک سیاہ رنگ کی کار نظر آئی لیکن اسلم نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ جب وہ کار کے قریب پہنچا تو کار کے اندر بیٹھے ہوئے دو آدمیوں میں سے ایک نے پھرتی سے کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور اسلم کو گاڑی کے اندر کھینچ لیا اور اس کے منھ پر رومال رکھ دیا جس کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گیا۔
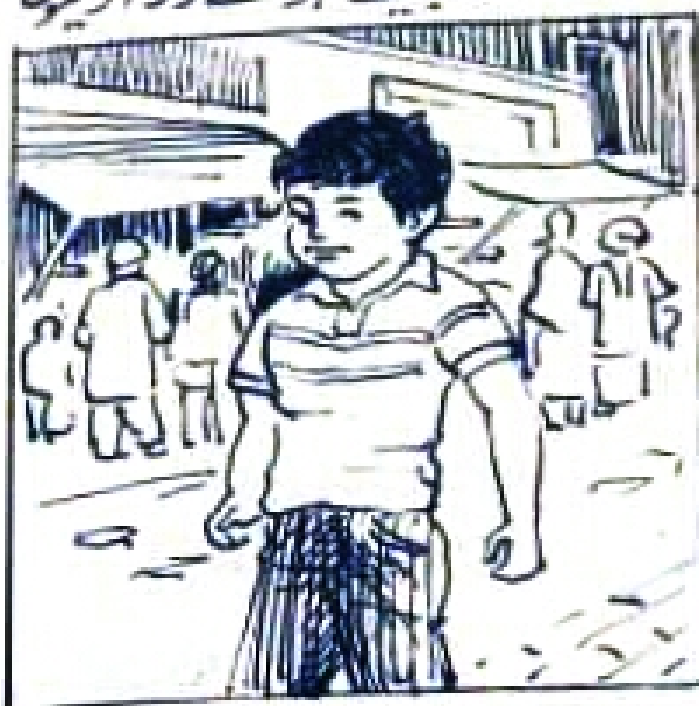
جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے کمرے میں پایا جہاں پر صرف ایک اونچا روشندان تھا جس سے روشنی اور ہوا آتی تھی۔ ابھی اسلم کمرے کو دیکھ ہی رہا تھا کہ اسے قدموں کی چاپ سنائی دی اور کمرے کا دروازہ کھلا جس سے ایک لمبی گھنی مونچھوں والا آدمی داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ اس نے اپنی گرج دار آواز میں اسلم کو کھانے کے لیے کہا اور ٹرے چھوڑ کر اوپر چلا گیا۔

دوسری طرف اسلم کے والدین نہایت ہی پریشانی میں اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ شام کے وقت جب وہ دونوں تھک کر گھر آئے تو ڈرائنگ

روم میں رکھا ہوا فون بجنے لگا۔ اسلم کے والد صاحب نے فوراً آگے بڑھ کر اُسے اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک گرج دار آواز سنائی دی:
"سیٹھ صاحب! اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسلم کی زندگی جاری رہے تو کل شام پُرانے کھنڈر کی طرف ایک لاکھ روپے نقد لے آئیے۔ اگر پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش کی تو اسلم کو ختم کر دیا جائے گا۔" اور دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔

اسلم کی ماں کے پوچھنے پر اکرم صاحب نے سب قصہ بیگم کو بتایا۔ اب تو بیگم اکرم کی جان ہی نکل گئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اکرم صاحب سے رقم کا بندوبست کرنے کے لیے کہنے لگی۔ اسلم کے والد صاحب نے صبح ہوتے ہی بینک سے ایک لاکھ روپے نکلوائے اور شام کا انتظار کرنے لگے۔ اسلم نے جب اپنے آپ کو قید پایا تو وہ سب کچھ سمجھ گیا کہ اُسے اغوا کیا گیا ہے۔ ان چوبیس گھنٹوں میں اسے اپنے والدین بہت یاد آئے اور وہ بلک بلک کر رونے لگا لیکن اچانک اس نے سوچا کہ وہ ان مجرموں کو گرفتار بھی کرا سکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے تو اُسے رنگ اور برش مل گئے اور کمرے ہی میں اُسے ایک رجسٹر نظر آیا جس میں چند صفحے خالی تھے۔ اسلم نے کھانے کی پلیٹ کے ایک طرف رنگ گھولا اور اس شخص کی تصویر بنانے لگا جو کھانا لے کر آیا تھا۔ اسلم نے آدھے ہی گھنٹے میں اس کی تصویر بنالی اور اسے سکھانے کے بعد اس نے اسے احتیاط سے جیب میں رکھ لیا اور پلیٹ کو دھو کر واپس رکھ دیا۔ شام کو وہی شخص دوبارہ آیا اور اسے لے کر دوسرے کمرے میں پہنچا۔ وہاں ایک دوسرا شخص بھی موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی اسلم نے اسے فوراً پہچان لیا۔ یہ وہ ڈرائیور تھا جس نے اس دن اسلم کے اغوا کے وقت کار چلائی تھی۔ یہ دونوں اسلم کو لے کر پُرانے کھنڈر پہنچے۔

تھوڑی دیر کے بعد اسلم کے والد اپنی کار پر وہاں آئے۔ اُن سے

ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ گرج دار آواز والے نے آگے بڑھ کر بریف کیس لیا اور اسے کھولا۔ بریف کیس سو سو کے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ گرج دار آواز والے نے اسلم کو اس کے والد کے حوالے کیا اور اسلم کے والد اسے کار میں بٹھا کر گھر لے آئے۔

اسلم کی امی اسلم کی بلائیں لینے لگی۔ اتنے میں اسلم کے والد بولے: "میں تو ان غنڈوں کو پہچان بھی نہ سکا، ورنہ پولیس کو ضرور خبر کر دیتا۔" اسلم نے یہ سنا تو اپنی جیب سے گرجدار آواز والے غنڈے کی تصویر نکال کر دکھائی۔ تصویر دیکھتے ہی اس کے والد پولیس سٹیشن پہنچے اور پولیس انسپکٹر کو سارا واقعہ سنایا اور اسے وہ تصویر دکھائی۔ انسپکٹر نے پرانے ریکارڈ کی تصویروں کو دیکھا تو ایک تصویر بالکل اس جیسی تھی۔ اس تصویر والے شخص کا نام دادا تھا جو شہر کا ایک خطرناک غنڈہ تھا۔ پولیس انسپکٹر کو اس کے ٹھکانے کا علم تھا۔ وہ چند سپاہیوں کو لے کر اس کے اڈے پر پہنچا اور اسے گرفتار کر لیا اور اس کے قبضے سے وہ ایک لاکھ روپے کی رقم بھی برآمد کر لی۔

اسلم کے والد نے اسلم کو شاباش دیتے ہوئے کہا:

"یہ تمام رقم اسلم ہی کی وجہ سے واپس ملی ہے۔"

اب اسلم نے بھی بلا مقصد آوارہ گردی کرنے سے توبہ کر لی اور اپنے والدین کا کہنا ماننا شروع کر دیا۔ کیونکہ اب اسے یہ احساس ہو چکا تھا کہ والدین اسے کیوں نصیحت کرتے تھے۔ اب وہ اُن کا ہر کہنا مانتا تھا۔

روٹیاں

فوقیہ بزمی (لاہور)

بعض لوگ اپنی کہانیوں میں لکھتے ہیں کہ ہماری خالہ ہمارے لیے زحمت بن کر آتی ہیں، لیکن ہماری خالہ ہمارے گھر میں رحمت بن کر آئی ہیں۔ آپ سوچ

رہے ہوں گے کہ وہ کیسے ؟ تو سنیے ! یہ ہمارے چھوٹے ہونے کا واقعہ ہے۔ دراصل ہماری خالہ کے گھر ہماری ہی ہم عمر دو لڑکیاں ہیں۔ بس جب بھی خالہ آتی ہیں، ان کو ساتھ لے کر آتی ہیں۔

ایک دن خالہ دوپہر کے وقت آئیں تو امی نے کہا کہ جاؤ تینوں بازار سے روٹیاں لے آؤ۔ ہم نے پیسے اور رومال پکڑا اور بازار کی طرف چل دیے۔ ایک کا نام منزہ اور دوسری کا نام کافیہ ہے۔ کافیہ دراصل تھوڑا تھوڑا توتلا بولتی ہے۔ ہاں تو ہم تینوں تنور کی طرف گئے۔ ابھی ہم روٹیاں لے ہی رہے تھے، کافیہ چیخ کر تنور والے سے بولی: چھوٹو! تمھارے تنور میں میلا لٹو گل گیا ہے (چھوٹو تمھارے تنور میں میرا لٹو گر گیا ہے)

اب میں اور منزہ ہنستے ہنستے رہے تھے اور دکان دار ہمارا منہ دیکھ رہا تھا۔ اب کیا بتائیں کہ ہم کتنے شرمندہ ہوئے۔ خیر روٹیاں لے کر گھر آئے اور اسے ساتھ لے جانے سے توبہ کرلی۔

اب پھر دستک ہوئی ہے۔ دروازہ کھولتے ہیں۔ لیجیے خالہ آگئیں۔ امی نے کہا: جاؤ بوتلیں لے آؤ۔ بوتلیں لینے میں اور منزہ گئے۔ کافیہ کو لے جانے سے تو پہلے ہی توبہ کرلی تھی۔ ویسے بھی آج روٹیاں گھر پہ پکی تھیں۔

عقل مند کی زبان دل میں ہوتی ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر بات کرتا ہے۔ نادان کا دل زبان پر ہوتا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے بولتا چلا جاتا ہے۔